جگنو

عفّت موہانی

قیمت

ناشر: نسیم انہونوی

نسیم بک ڈپو - لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون } آفس: ۲۴۵۵۹
رہائش: ۲۵۴۳۴

باہتمام عزیز الرحمٰن، الواعظ صفدر پریس لکھنؤ میں شائع ہوئی دسمبر ۱۹۸۲ء

ساز اور گھنگھرو ایک ساتھ بج اٹھے۔ رقص کرنے والے کے سومی قدم شفاف فرش پر ہلکورے لینے لگے۔ آرکسٹرا کبھی تیز کبھی مدھم بجتا رہا۔ عجیب لے تھی۔۔۔ عجیب دھن تھی۔ وہاں سب خوش تھے۔ ان سبھوں کی آنکھوں میں سحر انگیز روشنی تھی۔ جیسے وہ اپنے سارے غم بھول چکے ہوں لبوں پر بے پروائی کی مسکراہٹ جیسے انہیں سب کچھ مل چکا ہو۔

صرف ایک ہستی تھی جس کے لب تبسم ناآشنا تھے، آنکھیں ویران اور انداز سوگوار تھے۔ وہ اپنی ہستی سے بیزار اور زندگی سے تھک گیا تھا۔ زندگی.... کیا اسے زندگی کہا جا سکتا تھا۔ تھکی تھکی جیسے مسلسل چلتے چلتے تھک چکی ہو۔

موسیقی سے دردناک کراہیں لگ رہی تھیں۔ چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی کتنی تاریک تھی، جس میں اُسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

بے معنی انداز میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا اور رہ رہ کر اپنے سامنے رکھی ہوئی ٹھنڈی کافی کے گھونٹ لے لیتا۔ اُس کے پاس والی کرسی پہ بیٹھی تو قیر بھی اُسے بڑی دور لگتی۔ آہستہ آہستہ ہمیشہ کی طرح وہ سب کچھ بھولنے لگا۔ ناشاد و ناکام، بدنصیب و نامراد۔ وہ اسی قابل ہے کہ جلے اور جلایا

جائے۔ اس کی راہ میں محبت کے پھول نہ کھلیں۔ جس کا محروم دل پیار بھری راگنی سننے کو ترستا رہے۔ وہ کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کسی کے پاس اُس کے دُکھ کا تدارک ہے نہ مداوا۔

آہ۔ کچھ نہیں .... اُس نے بے خبری میں سر تھام لیا۔

"آپ پھر سوچنے لگے ...." توقیر دیر سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا دل دُکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ... توقیر .... ! چلو چلیں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہیں چھوڑتا ہوا گھر چلا جاؤں گا۔"

فلور ڈانس اپنے شباب پر تھا۔ لیکن توقیر کو مجبوراً اُس کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔

خوبصورت اور قیمتی کار ملگجے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی سڑک پر خاموشی سے پھسل گئی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" توقیر نے اُس کا بازو تھام لیا "آپ کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ شاید کوئی آپ کا دُکھ بانٹ لے۔"

"نہ دُکھ ہے، نہ غم ہے۔" اُس نے کہا "یا ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی بالکل بے حس ہو گیا ہوں۔"

"پھر آپ اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں ...؟"

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ تمہیں کیا بتاؤں ؛ میں ہمیشہ سے ایسا ہوں یا بن گیا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں توقیر! کون سا ایسا حادثہ تھا جس نے مجھے احساس کی لذتوں سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔"

"آپ نے کسی سے پوچھا بھی نہیں ؟"

پوچھا تھا۔ مگر میں بھول گیا کہ میرے دیوانہ پن کی کیا وجہ بتائی گئی تھی۔ تم ہی بتاؤ! تم تو مجھے نہ جانے کب سے دیکھ رہی ہو؟ کیا آج سے دس سال پہلے بھی ایسا ہی تھا جیسا آج ہوں؟"

"بخیر بھائی!" وہ مسکرائی "دس سال پہلے میں صرف دس سال کی تھی۔ مجھے اس زمانے کا بالکل ہوش نہیں۔ ورنہ میں آپ سے کچھ بھی نہ چھپاتی۔"

"ٹھیک ہے۔ لوگ تمھاری طرح مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں اور مجھ پر الجھن کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو میں رونے لگتا ہوں۔"

"سنئے! مجھے مردوں کے آنسوؤں سے نفرت ہے۔ اس چشمے کا سرچشمہ تو ہماری آنکھوں میں ہے۔"

بخیر ہنسنے لگا۔ "بہت اچھی اردو بولتی ہو۔ میں جب سے آکسفورڈ سے آیا ہوں، اچھی اردو نہیں بول سکتا۔"

"آپ کو یاد ہے؟ آپ آکسفورڈ سے کب واپس آئے تھے؟"

"ہاں، کاغذات دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے۔ ویسے مجھے نہ اپنا جانا یاد ہے نہ واپس آنا۔"

"بخیر بھائی! دیکھئے رویا نہ کیجئے۔"

"آہوں اور آنسوؤں سے نفرت نہ کرو بہن! ایک وقت آتا ہے کہ آہیں نہ بھرنے اور آنسو نہ بہانے پر زندگی بے مزہ اور پھیکی لگنے لگتی ہے۔"

"مگر آپ جو ہمیشہ احساسات کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں۔ یہ بھی تو اچھا نہیں ہے۔"

"کسی کی خاطر مجھے ہنسنا بھی تو نہیں آتا" وہ مسکرایا اور اسٹیرنگ وھیل میں کہنی ٹیک کر سگریٹ سلگایا۔ پھر لائٹر اور سگریٹ کیس جیب میں

ڈالتا ہوا بولا "یہ قہقہے اور چہچہے جن کے نرغے سے نکل کر تم آ رہی ہو، یہ سب تصنع اور بناوٹ ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کے دل میں غم کی بھٹی سُلگ رہی ہو گی۔ غم سے کسی کو نجات نہیں۔ قہقہے لگانا فرار ہے۔ غم سے نجات نہیں ہے۔"

"اگر سب آپ ہی کی منطق پر چلیں تو دن رات روتے چلاتے رہیں۔ غم کو سہارنا بھی تو بڑا کام ہے نجیب صاحب!...."

"ہاں، ظرف والوں کی چیز ہے۔"

"اچھا جب آپ کو یاد آ جائے کہ آپ کو کون سا غم ہے تو آپ مجھے ضرور بتائیے گا! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سینے میں لاوا ابل رہا ہے۔"

"یہ لاوا" وہ ہنس پڑا "احساسِ شکست ہے۔ اپنے آپ سے بدلہ لینے کا طریقہ ہے۔"

"کیوں آخر۔" توقیر اُسے کریدنے پر تُل گئی۔

"کیوں آخر میں پاگل ہوں" وہ برہم لہجے میں بولا "میں کیوں نہیں جانتا میں کیا کر رہا ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہئیے؟.... کبھی کبھی میں بہت کچھ سوچنا چاہتا ہوں اور کچھ سوچ نہیں سکتا۔ کیا تم بھی اس بات کو محسوس نہیں کرتیں؟"

"کرتی ہوں۔ تبھی تو میرے دل میں آپ کا اتنا درد ہے۔"

"ایک پاگل کے لیے؟" نجیب یہی سمجھا وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ یوں ہی بدگمان تھا۔ سیدھے سادے لب و لہجے بھی اُسے مشتعل کر دیتے

"خدا کے واسطے اپنے آپ کو پاگل نہ کہیئے۔" توقیر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ "آپ کی قنوطیت نے آپ کو ایسا بنا رکھا ہے۔ ہم میں آ کر بیٹھیے بولیئے

ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔"

گاڑی بدستور چلتی ہی رہتی۔ اگر توقیر اسے یاد نہ دلاتی۔

"آگے سے موڑ لیجئے گا! میرا گھر آ گیا۔"

"اچھا!" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "بتا دینا کہ کدھر سے موڑ دوں؟"

توقیر کے دل پر دھکا لگا..... ایسا حسین، پرکشش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی مگر اس قدر بدحواس!۔

"بس ادھر سے۔" توقیر بولی۔

اس نے کار موڑی اور گیٹ کے پاس روک لی۔ وہ اتری اور دو قدم پیچھے ہٹ کر بڑی پرکشش ادا سے اسے رخصتی سلام کیا۔ اس نے مسکرا کر پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ایسے نہیں....." توقیر ہنسنے لگی۔ "آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ کوئی دعا دیجئے۔"

"دعا۔!" ایک آہ اس کے لبوں پر مچلی۔ "کاش! دے سکتا... جب قبول نہیں ہو سکتی....."

"دے تو دیجئے!"

"خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ ہمیشہ خوش رہو... اور... اور... تمہیں اچھا گھر ملے۔"

"اچھا سنیئے! آپ اپنے گھر کیسے جائیں گے؟" توقیر اچھل پڑی۔

"وہ مجھے یاد ہے۔ کرنل اختر کی کوٹھی..... ہے نا؟..."

توقیر کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ گم صم کھڑی رہی۔ نجیم نے گاڑی موڑی اور اندھیرے کے سمندر میں ڈوب گیا۔

توقیر ایک لمحے کے لیے بھی دیر کیے بغیر اندر بھاگی اور کرنل صاحب کو فون کر دیا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے نغیر صاحب کلب سے واپس کوٹھی پہنچ رہے ہیں۔"
پھر وہ ریسیور تھامے کھڑی رہی اور اس کے آنسو اس پر گرتے رہے۔

"میرا دل پھٹ جائے گا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔"
وہ دونوں ہاتھوں سے دل کو دبائے بستر پر اوندھا گیا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں اور گہری بند آنکھوں سے شدید کرب و اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند بے چین کروٹوں کے بعد وہ پٹی پر سر ڈال کر غافل ہو گیا۔
اس کا جسم بستر پر تھا اور دماغ ـــ اس انبوہ کے ساتھ جو غلغلۂ لزم میں آہستہ آہستہ آگے سرک رہا تھا ـــ وہاں شور تھا، غل تھا ـــ رہ رہ کر وہ کار ٹھہراتا اور نیچے اتر کر باجے والوں کو ہدایت دیتا۔ اس کے پاس کوئی اور بھی تھا۔ پھولوں میں گم، خوشبو میں کھویا ہوا۔ گم صم کھیل اور ـــ جو فاتح تھا ـــ اور نغیر کو شکست دے کر انسانی زندگی کا قلعہ فتح کر چکا تھا ـــ اس کی خاموشی قہقہہ بہ لب تھی۔ وہ عجیب سے رتر لگ رہا تھا۔ اور نغیر ـــ جس نے بے طلب اپنی متاعِ حیات و محبت ہاری تھی۔ وہ بھی قدرت کی ستم ظریفی پر خندہ زن تھا۔ بے انصافی اور ظلم تو تھا ہی۔ وہ نواز دیے گئے، جنھیں کسی چیز کا ادراک اور شعور ہی نہیں تھا۔ اور جو دعائیں مانگتے مانگتے تھک گئے، جن کے ہاتھ اٹھے اٹھے رہ گئے، جن کے دل مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ انھیں کچھ

بھی نہیں ملا۔

وہ کب کا قائل ہو چکا تھا۔ تقدیر کا مذاق انتہا ہی روح فرسا اور جاں گسل ہوتا ہے۔ یہاں اتفاق ہی سے کوئی بات بنتی ہے اور پھر زندگی کا کوئی مقصد تو ہوتا ہے۔ جس حیات بے ثبات کا کوئی مقصد ہی نہ ہو وہ کس کام کی۔

دن رات وہ ایک ہی آرزو کے پیچھے سر پٹختا پھرا۔
اُس کی آرزو نے کبھی اظہار کا جامہ نہیں پہنا۔
آنکھوں کی زبان ہمیشہ خاموش رہی۔
اور اس کی محبوب ہستی کو کوئی اپنی راہ پہ لے کر چلا گیا۔

وہ شروع ہی سے حساس تھا۔ بے حد جذباتی۔ چھوٹی سی بات کو بہت بڑی کر کے سوچنے والا۔ جسے کوئی نہ سمجھ سکا اور جو خود کو بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

اس کا بچپن بھی گوناگوں کشاکش سے ملوث گزرا جسے اب وہ فراموش کر چکا تھا۔ اُسے یاد بھی نہ تھا اُس کے والدین کون تھے؛ یہ جو آس پاس چلتے پھرتے سائے ہیں وہ کس کے ہیں — ؛ منت وہ کسی کو باپ کہتا، کسی کو ماں — مگر اُسے رشتوں کی تقدیس یاد نہ رہی تھی۔

پہلے وہ بہت شریر اور کھلنڈرا تھا، ہمیشہ ہنستا رہتا۔ تعلیمی میدان میں وہ سب سے آگے رہا۔ اس نے جو کچھ مانگا اُسے مل گیا، جو خواہش کی پوری کر دی گئی۔ وہ ایسی ہی صورت و سیرت کا مالک تھا۔ مگر وہ اپنے ساتھ عالم علوی سے دو ہی چیزیں لایا صورت و سیرت ... رہی قسمت سو وہ دینے والے نے نہیں دی۔ یا وہ اپنے پیچھے آسمان ہی پر بھول آیا تھا

نہیں کیا حادثہ گزرا۔ اُس کی قسمت کے ساتھ۔ اب وہ بے تقدیر جی رہا
تھا۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے جب کسی مجرم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔
تو اس کی ہر خواہش پوری کر دی جاتی ہے۔ اور قدرت جب کسی کو بدنِ غم
بنانی ہے تو بدلا دے اور تلافی کے طور پر پہلے ہی اُسے لامحدود خوشیاں
بخش دیتی ہے۔

وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دُکھ کس بلا کا نام ہے۔ غم کسے کہتے ہیں؟
اور اب... صرف یہی دو چیزیں یاد تھیں۔
وہ نہیں جانتا تھا خوشی کیا چیز ہوتی ہے؟ مسرت کس کو کہتے ہیں؟
وہ ایک متمول کرنل کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑا خوبرو، نہایت شریف اور
بہت زیادہ پڑھا لکھا...

پانچ برس پہلے فارن سے سائنس کی اعلیٰ ڈگری لے کر آیا تھا۔
ایک شاندار مستقبل اس کا منتظر تھا۔ کئی ایک تعلیمی اداروں نے
خود سے پیشکش کی تھی کہ وہ اپنی معلومات سے ادارے کو فیض پہنچائے۔
ابھی وہ اپنے مستقبل کی کوئی راہ متعین نہ کر سکا تھا کہ اُسے حادثہ پیش
آیا۔ اُس کے اعزاز میں کئی ایک جگہ دعوتیں ہوئیں۔ ایک رات وہ کسی دعوت
سے واپس آیا تب خود فراموش سا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ سب کچھ بھولتا
گیا۔ کوئی نامعلوم بیماری اس پر چھا گئی۔ بیٹھے بیٹھے کراہ اٹھتا۔ اور
کہتا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔ کرنل صاحب نے اس کے علاج کی
خاطر اپنا سرمایہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ شہر اور بیرون شہر حتیٰ کہ
غیر ممالک کے ڈاکٹر تک تھکے... لیکن کوئی کہہ نہ سکا کہ اس کا مرض کیا ہے۔ وہ دل
کی بیماری بھی نہ تھی کہ اس کا علاج کیا جاتا۔ وہ نہ جانے کیا تھا؟

اور پھر اُس کی خود فراموشی ــــ گھر والے پریشان رہنے لگے ۔
کیا سوچا تھا کیا ہو گیا ! اب وہ کس کام کا تھا ۔!

کامل پانچ سال گزر گئے تھے اور متواتر شب و روز گزرتے چلے جا رہے تھے ۔ کرنل صاحب کی کمر ٹوٹ چکی تھی ۔ نسیمہ ماں کا سہارا نہ ہونے کے برابر تھا ۔ وہ اُسے دیکھتیں اور آہیں بھر کر رہ جاتیں ۔ کرنل صاحب تجربے کرتے کرتے تھک گئے ۔ مگر ہنوز نہ دوا میں اثر تھا نہ دعا میں ۔

مگر پھر اُس کے چاہنے والے موجود تھے ۔

باہر اُس کے بہت سے دوست تھے جنھیں اس سے بے پناہ لگاؤ تھا ۔ ان میں سعادت ایسا تھا جو ظہیر کے پسینے پر خون بہانے کو تیار تھا ۔ اس کی منگیتر توقیر تھی ۔ دونوں ظہیر کو بے انتہا چاہتے تھے ۔ دونوں اپنے سارے مشاغل ترک کیے اس کے آگے پیچھے پھرا کرتے ۔ اور یہی کوشش کیا کرتے کہ ظہیر کی ذہنی صحت کا سہرا انھیں کے سر بندھے ۔

توقیر بڑی مخلص تھی ۔ وہ ظہیر کو جانے کہاں کہاں لیے پھرتی ۔ ہر جگہ اُسے یاد دلاتی کہ شاید حواسوں کی واپسی کے لیے کوئی جگہ یا واقعہ نقطۂ آغاز بن سکے ۔ چھیڑ چھیڑ کر اس سے پچھلی باتیں پوچھتی ، خفا بھی ہوتی ۔ پیار بھی کرتی ۔ مگر ظہیر چٹان تھا ۔ توقیر ناامید نہیں ہوئی تھی ۔ اسے کامل یقین تھا کہ ایک دن ظہیر صحت مند ہو جائے گا ۔ مگر کون سا [illegible] ؟ ... یہ کون بتاتا ؟ ـــ

[illegible] وہ [illegible] کی دوست کی بہن سے ملا تھا ۔ تب [illegible] کے سینے میں بھڑک اٹھی تھی ۔ رضیا اسے بہت چاہتی

اُس کی بہن اپنے مثالی حسن سے بے خبر جب عبیر کے سامنے آئی تو اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا وہ کس کی بربادی اور تباہی کا باعث بن رہی تھی ۔۔۔؟

اس رات وہ بہت کھویا کھویا رہا۔ جانے کیوں... پھر رضا نے اُسے سحابی کو کوئی انسٹرومنٹ سکھانے پر آمادہ کرلیا۔ لیکن وہ اُسے کچھ سکھا نہ سکا۔ بھول ہی گیا تھا کہ ساز سے آواز کس طرح پیدا کی جاتی تھی؟ اس کا ہاتھ رُک رہا تھا۔ کوئی گھٹن اسے بے قرار کر رہی تھی۔ وہ کچھ چاہتا تھا جو کر نہیں سکتا تھا اور وہ یکبارگی ساز پھینک کر دیوانوں کی طرح چیخ اُٹھا۔

سحابی دم بخود رہ گئی۔ وہ حسین تھی بے حد حسین۔ صبح کے تارے کی طرح۔ جب اس نے عبیر کے روپ میں ایک دیوانے کو دیکھا تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُس کے قدم بھی آپ ہی آپ اٹھے اور وہ اس یادگار پردے کو تھامے کھڑا رہ گیا جس پر جنگلی گلاب کی تصویر بنی تھی۔

پھر سحابی کے قدم اس حد تک نہیں آئے۔ وہ کسی موہوم آس پر وہاں کئی بار گیا۔ اس کی بے قراری اور اضطراب دیکھ کر رضا نے ہنس کر کہا تھا:

"تم عجیب آدمی ہو۔ کیا تم بیٹھے بیٹھے بھی سو جاتے ہو۔ تم نے شراب تو نہیں پی ہے ۔۔۔؟"

اس کی ندامت انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خاموش محبت کو زبان عطا کرے۔ نہ کہ یہ تو سحابی کا بھائی تھا جو اس کا عزیز دوست تھا۔ وہ روز اس سے ملنے جاتا اور جان بوجھ کر کوئی

چیز وہاں بھول آتا جو دوسری صبح اُسے مل جاتی۔ لیکن وہ چیز جو اوّل روز رضا کے گھر بھول آیا تھا، اُسے کبھی واپس نہیں ملی۔

وہ میوزک پروفیسر تھا۔ ہر ساز پر اُسے قدرت حاصل تھی۔ اس نے ملکوں ملکوں پھر کر کئی ڈپلومے حاصل کیے تھے۔ جو اب کسی کام کے نہ تھے۔

پھر وہ گم ہو گیا۔ کھوتا رہا اپنے آپ کو۔ نہ جانے کہاں؟ نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ ایک اشتیاقِ دید کی خاطر اس نے در محبوب کے کئی چکر لگائے مگر بے سود۔

وہ سوچتا رہا کوئی بات ایسی ہوگی جو سحابی خود بخود اُس کی ہو جائے گی۔ مگر اس کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اُس کے نام سحابی کی شادی کا رقعہ آیا۔ اسی کا ایک دوست عظمی اس کا بن گیا تھا، جو گمنام تھا جیسے سحابی کے والد نے اپنی فرم میں ملازمت دی تھی، جو بالکل قابل نہ تھا۔ مگر جو بہت کچھ ہو گیا تھا۔

جبیر اس کی شادی میں مہمان کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ بالکل خود فراموش سا۔ جیسے اُسے یہ بھی یاد نہ ہو کہ وہ زندہ تھا اور دنیا کے آب و گل میں سانس لے رہا تھا۔

اپنے ارمانوں کی لاش جب اس نے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گورستان تک پہنچا دی تب حواس کھو دیے۔

سحابی کی خوشیوں کی ڈولی اور جبیر کے ارمانوں کا ڈولا ایک ساتھ اٹھ گیا۔

وہ رونا بھول گیا۔ رونے سے کون تقدیر بدل جاتی۔ اُس کے

سامنے اس کی خوشیوں کا دفن تھا جس پر آہوں کی چادر چڑھی تھی۔ لیکن
آنسوؤں کے پھول اس نے نہیں چڑھائے۔ آنسو جو رازِ دل آشکار کر دیتے ہیں
لیکن جس کی یاد اس کے برباد دل سے کبھی نہیں نکلی۔
اس کے ساتھ گزاری ہوئی ایک ایک گھڑی اسے یاد آتی تھی۔
اس کی زندگی میں بے شمار لڑکیوں نے دلچسپی لی۔ بعض تو بہت قریب آگئیں لیکن
وہ سب سے دامن کشاں رہا۔ یہ تو بہت بعد کو پتہ چلا کہ وہ اپنے ہوش حواس
میں نہیں تھا۔ اسے صرف بارات یاد رہ گئی۔ اس کے شور و غل میں
اس کی اپنی شخصیت کبھی کی ڈوب چکی تھی۔
اسے کسی پل قرار نہ تھا کسی کے شب و روز حسن و شباب کی ارمان انگیزیوں
میں فردوس بدوش ہوں، کوئی محروم محبت ہو۔
کوئی حسن کی دولت سمیٹے، کوئی حسن کی دید کو ترسے۔
پھر وہ یکایک بے تاب ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اور دل کو دونوں
ہاتھوں سے دبائے فرش پر گر پڑا۔
" آہ — میرے اللہ — میرا دل پھٹ جائے گا "
وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔
" آج پھر دورہ پڑ گیا ...." کوئی کمرے میں آیا۔ نو عمر سی لڑکی تھی
[illegible] تھی اور آنکھوں سے گہرے غم کا اظہار ہو رہا تھا۔
[illegible] کبھی کبھی [illegible] کرتے ہیں ..... میرے خدا۔ میں کیا کروں تمھارے
[illegible] کیا پانی [illegible] وہ اس پر جھک کر آوازیں دینے لگی۔
پھر وہ [illegible] اور کرنل صاحب اندر آئے۔
" سر ر ! " ان کا لہجہ مغموم تھا۔

"پھر بے ہوش ہو گئے بھائی جان!" — سریہ کا لہجہ ان سے زیادہ دکھی تھا۔ "کچھ کیجئے! آخر کب تک یہ اسی طرح کا عذاب سہتے رہیں گے؟"

"اللہ پر چھوڑ دو بیٹی! اب بے چارہ انسانوں کی چارہ گری سے گزر چکا۔ خدا ہی کوئی کرشمہ دکھائے تو دکھائے۔"

"بھائی جان — مگر — میں منہ پر پانی چھڑکوں۔"

"نہیں" ایک گہری آہ بھر کر انھوں نے کہا "ہوش آئے گا تب زیادہ بے قرار ہوگا۔ جب تک بے ہوش رہے گا پُرسکون رہے گا۔"

سریہ چپکے چپکے رونے لگی۔

"میرے خدا — یا تو جبیر کو صحت دے۔ یا پھر سب کو ان کے ساتھ ساتھ دنیا سے اٹھا لے۔

اب تو جی بھر گیا۔ پروردگار!

"کل دانش صاحب ملے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ جرمن کا کوئی ماہر نفسیات ہے مگر وہ کہیں آتا جاتا نہیں۔ کیا کیا جائے؟" کرنل صاحب نے کہا اور رک کر سگار سلگانے لگے۔

"تو پھر بھائی جان، جبیر کو وہاں لے جائیے" سریہ بے تاب ہو گئی۔

"بیٹی! بہت دن لگیں گے۔ پاسپورٹ اور ویزا کا جھگڑا ہی مہینوں میں ختم ہو سکے گا۔"

"جہاں اتنے دن گزرے وہاں کچھ دن اور بھائی جان! اگر ذرا بھی فرق پڑ جائے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"بھائی جان! دانش صاحب نے کچھ کہا نہیں کہ مدحت اپنی پھوپھی کے یہاں کب آ رہی ہے؟"

"نہیں ... میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"بھائی جان! مدحت اپنے نجیر کے لیے کتنی اچھی ہے۔"

ایک طویل سانس کرنل صاحب کے سینے سے نکلی "اس کی خواہش کرنا بچے کا چاند کے لیے مچلنا ہے سریہ! اس کا تذکرہ ہی نہ کرو! بھلا ایک نیم پاگل، بد دماغ کو کون شخص اپنی نازوں کی پالی اور کم عمر بہن بیاہنا پسند کرے گا خدایا یہ ہماری بچی پوری کرے۔ کیا کچھ میں نے اور تمھاری ماں نے نہیں سوچا تھا۔ مگر انسان سوچتا کچھ ہے، اللہ کرتا کچھ اور ہے۔ آہ ۔ میں خود بھی کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ میرا ایک ہونہار، حسین اور جوان بیٹا۔ اور اس حالت میں یا خدا یا خدا! یا تو اسے صحت دے دے یا مجھے موت دے دے۔"

یک بیک نجیر نے ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ دونوں چونک پڑے۔ کرنل صاحب سگار باغ میں پھینک کر بیٹھے اور سریہ نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھالیں۔

نجیر نے اپنی نیند اسی آنکھیں کھول دیں اور خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگا۔

کرنل صاحب نے خود کو ہشاش بشاش کرلیا۔ سریہ بھی مسکرائی۔

"بیٹے! تم ناوقت سو گئے تھے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"نخرے بہت کرتے ہیں" سریہ بگڑی "بھلا یہ وقت کوئی سونے کا ہے بس اب اٹھ جاؤ!"

نجیر ایک طویل سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر پژمردہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ڈیڈی آپ ... کیا بات ہے؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر گویا بتا کہ غشی کے بعد ہوش آیا تھا۔ بے پناہ تھکن طاری تھی جیسے مسلسل پہاڑ پر چڑھتا رہا ہو۔

"ہاں بیٹے۔ میں دیکھنے آگیا تھا۔ تم کمرہ بند کیے کیا کر رہے ہو؟" کرنل صاحب نے چھڑی کا سہارا لیا "اور یہ جنگلی بچی؟" عبیر نے بناوٹی خفگی سے کہا اور گھور کر سربد کو دیکھنے لگا!۔

"اب پکے پانچ پنجے ماروں گی۔ عبیر!۔" وہ بپھر کر بولی "جانتے ہو۔ تمہارا اور میرا رشتہ کیا ہے؟!۔"

"ارے بھئی جھگڑے کو اٹھا رکھو پھر کسی وقت کے لیے" کرنل صاحب نے کہا "میں کہہ رہا تھا کہ شباہت کو فون کر دو۔ کہیں گھوم پھر آؤ۔"

"میں بھی چلوں گی!۔" سربد منہ پھلا کر بولی۔

"بیچاری بیٹی کو زکام ہوا ہے۔" عبیر ہنس کر بولا "ارے تم کہاں مردوں میں چلوگی۔ شرم نہیں آئے گی؟۔"

"بسور اکرتے ہیں۔ بار دگنے۔ صورت دیکھئے۔ بڑا بیٹھے ہیں مرد۔!" سربد بولی۔

"ڈیڈی آپ سُن رہے ہیں!" عبیر نے کہا۔

کرنل صاحب مسکرا رہے تھے۔ سربد بول اٹھی "ارے مرد صاحب میرے مقابلے پر خود آئے گا۔ کمک کے لیے ڈیڈی کو کیوں بلا رہے ہیں۔"

"اچھا جی؟!۔" اس نے طنز سے کہا۔

"ہاں جی؟!۔" سربد نے چیلنج کیا۔

"اچھا تو بیزار رہا ہوں!۔" عبیر نے جیسے ہی پلنگ سے پاؤں اتارا۔ سربد نے کرنل صاحب کے بازو سے چمٹ کر نعرہ لگایا۔

"بھائی جان دیکھئے نا۔!"

مقابلہ تمام شد۔ عبیر کو ہنسی آگئی۔ سربد نے اسے زبان چڑا دی۔ کرنل صاحب بے حد خوش تھے۔"

کم سے کم اسی طرح سے سہی ۔ عبیر اپنے غم کو بھول تو گیا تھا ۔ وہ بظاہر مطمئن تھے
مگر ان کا دل فکر و تشویش سے معمور تھا ۔ یہ فکر مندی اور اضطراب خیز نہیں رہ گئی تھی
پرانی ہو کر اپنی جگہ ایک مستقل خلش اور دکھ بن گئی تھی ۔ کیسی عجیب بے بسی تھی کرنل
صاحب خود بھی ایک ڈاکٹر تھے ۔ اپنے بیٹے کے علاج میں کچھ نہ کر سکتے تھے ۔ گو کہ
انھوں نے عرصہ سے پریکٹس چھوڑ دی تھی ۔ اور اپنے ایک شاگرد کو اپنا مطب دے
دیا تھا ۔ ہر ماہ وہ اپنے وہ آن کی خدمت میں رقم پیش کر دیتا اور بس کرنل صاحب
دل شکستہ ہو گئے تھے ۔ کبھی کبھی تو اس قدر مایوس اور نیم جاں ہو جاتے کہ سچے
دل سے اپنی موت کی دعا مانگنے لگتے !۔

برآمدے میں پر کہنی ٹیکے وہ سوچ رہے تھے ۔ اور سمندر اپنی آواز
میں جھگڑا کر رہی تھی ۔ کرنل صاحب کو کچھ بھی ہو رہا تھا ۔ توقیر کی سریلی آواز اور
عبیر کی کھلکھلی ہنسی بہت مدھم ہو کر ان کے شعور سے ٹکرا رہی تھی ۔

دفعتاً عبیر نے ان کے کندھے پر تھپڑ مارا ۔ وہ ایک طویل سانس لے کر اسے
دیکھنے لگے ۔

بھائی جان ۔ کہہ دیجئے ان سے کہ میرے ساتھ چلیں ۔ نہیں تو ۔ میں عمر بھر ان
سے بات نہیں کروں گی !۔

"ڈیڈی ۔ یہ کونسی عقلمندی کی ہے کہ میں بن بلائے مہمان کی طرح سر کی بلا

کے پاس چلا جاؤں۔" عنبر نے احتجاج کیا: "بھلا وہ دل میں کیا سوچے گی۔ جیسی یہ خود گنوار ہے۔ ویسے ہی اس کے رشتہ دار بھی ہیں!"

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" کرنل صاحب نے سرمد سے پوچھا۔

انہیں جواب دیئے بغیر سرمد بپھرا آنکھیں نکال کر عنبر پر چڑھ دوڑی۔ "میری سہیلی جیسے۔ تم اسے نہیں جانتے! پہلے تو ہاتھ جوڑ جوڑ کر میری خوشامدیں کیا کرتے تھے کہ خدا کے لئے مجھے بھی لے چلو اگر مدحت کے یہاں چلو۔۔؟"

"مدحت کے یہاں!" عنبر کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ اس کی یہ تبدیلی کرنل صاحب اور سرمد کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ چنانچہ سرمد نے اس کے بازو پر ایک چٹکی لے کر طعنہ کس ہی دیا۔

"ہا ہا۔ اب دیکھو کیسے لال ہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ پہلے مجھے جھنجھوڑ رہے تھے!"

عنبر ہنسنے لگا۔

کرنل صاحب اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اٹھ گئے۔ "ہاں۔ کوئی حرج نہیں ہو آؤ۔۔"

"مگر۔۔!" عنبر بولا۔

"کچھ نہیں۔" سرمد نے بات کاٹ دی: "اتنی دیر پڑے سوتے رہے ہو۔ اب نہاؤ دھوؤ اور تیار ہو جاؤ۔۔"

"نہیں سرمد۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔!"

"کیوں؟" وہ غصے سے بدحال ہو گئی۔

"مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ سرراہ دانش صاحب مل گئے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تھا مگر وہ بے رخی سے جواب دے کر پاس سے نکل گئے اور مجھ سے بات کرنا بھی

پسند نہ کیا۔ میں ان کے یہاں نہیں جاؤں گا۔ سرمد!"

"تمہیں دانش صاحب سے کیا مطلب؟—"

"ان سے مطلب نہ ہو۔ مگر مدحت سے تو انہی کی بہن۔ گھر تو ان کا ہے!"

"تمہیں یاد ہے عنبر کہ مدحت دانش صاحب کی بہن ہے؟" سرمد یا تو خفا
تھی یا خوش ہو گئی۔ عنبر نے اسے حیرت سے دیکھا اور پھر اسے گھورتا ہوا بولا۔

"احمق تو نہیں ہو گئیں۔ بھلا مجھے یہ بھی یاد نہ ہوگا۔ اچھا اب بھاگ جاؤ۔
میں باہر جاؤں گا!"

"اکیلے؟!—" سرمد نے تعجب سے پوچھا۔

"اور کیا میرے ساتھ آپا چلیں گی؟—"

"شباہت بھائی تو آئے نہیں!—"

"کان نہ کھاؤ۔ گھنٹہ بھر سے مسلسل بک بک کئے جا رہی ہو۔"

"اچھا تو میں مدحت سے کہہ دوں گی کہ عنبر تم سے خفا ہیں اور تمہارے یہاں
نہیں آئیں گے۔"

"خوب اچھی طرح نمک مرچ لگا کے کہہ دینا.... عجیب سنکی ہو!"

"ایک بات پوچھوں؟" سرمد نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ایک بات نہیں۔ دس باتیں!" عنبر نے جھنجھلا کر کہا۔ "بیٹھا تو ہوں تمہارے
سامنے۔ کھاؤ میری ہڈی کی اچھی طرح—!"

سرمد پیار سے ہنسنے لگی۔ اسے دلی مسرت ہوتی تھی جب وہ عنبر کو اس طرح
جھنجھلایا ہوا دیکھتی تھی۔ اسے اس بہت خوشی شاید کوئی واقعہ کوئی لطیفہ اور
ذرا دیر گفتگو اس کی یادداشت واپس لے آئے۔

دروازے پر کسی نے دستک دی — اور [illegible] لگی تھی کہ عنبر نے اپنا منہ اٹھا لیا

"تمھیں تنہا چھوڑتے خوف معلوم ہوتا ہے۔ چلو بوٹنگ کریں!"

"جی نہیں چاہتا!"

"اچھا تو آؤ۔ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔" شباہت نے بڑی خوشامد سے کہا۔ اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی سنک سے وحشت ہوتی تھی کہ کہیں نہر ہی میں چھلانگ نہ لگا دے۔ دور پہ نرم اور ٹھنڈی ریت کا ڈھیر پڑا تھا شباہت اسے لئے اسی ڈھیر پہ جا بیٹھا۔ شفق کا سرخ و زرد عکس پانی پہ تڑپ رہا تھا۔ اور ماحول یک بیک اُداس ہو گیا تھا۔

"یہ روشنی دیکھ رہے ہو شباہت!" شہیر نے پوچھا۔

"ہاں مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگتی!"

"زندگی میں اور اس کے سوا ہے کیا۔ کچھ روشنی کچھ اندھیرا۔ یادوں کا طلسم۔ غم و مسرت کی بھول بھلیاں۔ انسان کی زندگی بس پچاس ہی برس کی تو ہوتی ہے۔ اسی میں سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر کچھ بھی نہیں۔ فنا۔ اور اور اور اس کا خاتمہ۔ آخر یہ گورکھ دھندا قدرت کا طلسمی کارخانہ ہے کیا؟ میری سمجھ میں تو آج تک نہیں آیا!"

"اور کبھی آئے گا بھی نہیں..." شباہت نے کہا "لوگ بے سمجھے زندگی گزارتے ہیں۔ سمجھدار لوگ ہمیشہ تباہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اس چکر میں نہ پڑو۔ اور بہت سی باتیں ہیں۔ جنھیں آدمی نہ سمجھا ہے اور نہ کبھی سمجھے گا..... تم ایک مشورہ دو مجھے!"

اور واقعی شہیر سب بھول گیا جیسے شباہت کی نصیحت کا انتظار کر رہا ہو۔

شباہت نے ہنستے ہوئے پوچھا: "تمھیں ثروت کیسی لگتی ہے؟"

"یونیورسٹی کی تمام لڑکیوں سے زیادہ اچھی!"

تو یہی کہیے کہ تم نے کالج میں یہی سیکھا ہے۔ نگوڑی بے شرمی ۔"

توقیر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ "سچی ۔ سنو ۔ تیرے منہ سے خالص بامحاورہ ٹکسالی لکھنؤی لفظ سن کر ایسا لگتا ہے کہ بڑی شیخن مانی کے پاس بیٹھی ہوں ۔۔۔۔" پھر سنجیدہ ہو کر بات بدل دی ۔

"سچ مچ تم اس وقت نیلے لباس میں بیٹھی ایک خوش رنگ سی لگ رہی ہو جو ابھی آسمان میں اڑنے والی ہو ۔"

اس کی عادت تھی ہمیشہ اپنی گفتگو میں غیر ضروری تکیہ اس ٹھونس دیتا جس کا کوئی ربط مفہوم اور مطلب نہیں ہوتا تھا ۔

"خیر چائے پیو ۔" وحدت نے کہا اور ملازمہ سے ٹرے لے کر میز پر رکھی ۔

"تم کو تو خود سے کبھی چائے پانی کے پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی ۔" توقیر بولی "میں خود سے نہ کہا کروں تو قسم سے بھوکی ہی تمہارے ہاں سے جاؤں ۔"

"بی بی اللہ رکھے آپ کا گھر ہے ۔ پوچھنے کا کیا سوال ۔" وحدت نے ٹال دیا ۔

"گھر تو میرا ہی نہ میرا ہے نہ اس کا ۔ ہم تو بے چاری لڑکیاں بابل کے گھر کی چڑیاں ۔ جدھر اس گدھے نے اڑا دیں ۔ اڑ گئے ۔۔۔"

"تم جاؤ ۔" وحدت نے ملازمہ سے کہا وہ ہنستی ہوئی چلی گئی ۔

"بہت ارمان پھٹ پڑا ہے کہیں اڑ جانے کا ۔" وحدت نے آنکھیں نکالیں "میں کہہ دوں گی ۔ سنو بھیا جان ۔ پر کاٹ کے رکھیں ۔ سچ مچ کہیں نہ اڑ جائے ۔"

"قسم سے ۔" توقیر نے چہرے پر بناوٹی سنجیدگی لا کر سرگوشی کی "جب سے امی نے تمہارے شبو بھیا کو میری غلامی کے لیے منظور کیا ہے ۔ تب ہی سے تو یہ کیسے گندے ہو گئی ۔ وہ کہیں گے آم میں کہوں گی خربوزہ

"دے دیا ہے کسی کو اپنا دل — مبارک ہو —!"

"دیں مار بیٹھوں گی توقیر —!"

"کیوں کیوں — یہ رنگ کیوں بدل گیا — چہرے پہ اندر دھنش کی سی لالیاں —!"

رحمت نے دوپٹہ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بہت بدلگام ہو گئی ہو میں تم سے بات نہیں کروں گی —!"

"بیٹھی بھی رہو اب ایسی ننھی بچی نہیں ہو۔" توقیر ہاتھ بڑھا کر پکڑا اور رحمت کو اس کی کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اپنی عادت کے مطابق بات بدلتی ہوئی بولی "پڑوس میں ذرا مسعود صاحب پر مجھے یاد آیا۔ تمہارے لئے بھی تو شاید ابن بھیا کی بات آئی تھی —!"

اچانک رحمت کے کان جلنے لگے۔ اور گالوں پر آگ سی بھڑک اٹھی۔ تصور نے ایک پرکشش مردانہ پیکر نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ پل بھر کے لئے وہ ماحول سے دور چلی گئی۔ توقیر سے اس کی یہ غائبانہ تبدیلی کیونکر پوشیدہ رہتی۔ اس نے اس کے دہکتے ہوئے رخسار پر ننھا سا تھپڑ لگا کر کہا

"ہم سے کہاں چھپو گی تم ایسی کہاں کی ہو۔ سچ سچ بتا دو بی بی —!"

"تم سے کچھ چھپا نہیں توقیر — مگر کوئی بات ہو تو میں تمہیں بتاؤں گی!"

"قسم سے؟"

"یقین کرو —!"

"تم تو عمیر بھائی کو ناپسند نہیں کرتیں نا؟ —"

"تم اپنی کہو —"

"ارے میں نے تو انہیں بھائی بنایا ہے۔ ایسے اچھے آدمی ہیں — بھلا میں"

ناپسند کروں گی۔"

"اچھے آدمی سبھی کو اچھے لگتے ہیں!" مدحت یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"مجھے دکھ بھی بہت ہوتا ہے منّو!" توقیر نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔
"کاش۔ خدا نے انھیں دماغی صحت بھی دی ہوتی۔ کون سی کمی ہے ان میں۔ پہلی نظر
میں تو انسان مرعوب ہو جاتا ہے۔ پر ذہنی طور پر ایسے ہیں کہ باتیں کرو تو ڈر
لگے۔ قسم سے۔ ہفتہ بھر پہلے میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی ہمیشہ میری یہی
کوشش ہوتی ہے منّو کہ شاید باتوں باتوں میں کچھ ایسا ہو جائے کہ ان کی
یادداشت واپس آجائے۔ وہ بڑے دلکش انداز میں اپنے یونیورسٹی کے واقعات
بیان کر رہے تھے۔ اچانک خدا حافظ کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھکا بکا
ہو کر پوچھا کہ کیا ارادہ ہے۔ کہنے لگے کہ بس اب اجازت دیجیے۔ [illegible]
[illegible]۔ بہت دیر سے آپ کا وقت خراب کر رہا ہوں۔ گھر پر سب لوگ منتظر
بھی ہوں گے۔

"اللہ اکبر"۔ مدحت نے طویل سانس لے کر کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

توقیر کا گلا رندھنے لگا تھا۔ وہ پھر رک کر بولی "میں نے انھیں ٹوکا اور ڈانٹ کر
کہا کہ ہوش میں آئیے۔ مجھ سے ایسی باتیں نہیں چلیں گی!"

"کیوں ڈانٹا ایسے مجبور آدمی کو توقیر!"

"کیا کرتی منّو۔ پھر تو وہ اسی طرح گم ہو گئے تھے۔ تین چار منٹ تک بیٹھے کراہ کر [illegible] ہو جاتے
[illegible]" توقیر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بولی "میں نے انھیں ہوش دلایا کہ آپ
[illegible] ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مجھے البتہ اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ملنے آؤں
سب انھوں نے [illegible] نہیں معلوم ہے۔ [illegible]"
[illegible] بڑا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

مدحت نے بڑی دلچسپی سے پوچھا: "کیا کہا تھا؟"

"ارے کہنے لگے کہ آپ تشریف لے جائیے۔ میں نوجوان لڑکیوں کا اس طرح تنہائی
میں مردوں سے گفتگو کرنا انتہائی برا سمجھتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر چل دیئے۔! میں اپنا سا
منہ لے کر رہ گئی۔"

مدحت کا ہنستے ہنستے چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اچھا پھر؟"

"پھر کیا۔ جب دوبارہ ملے اور میں نے منہ پھلا لیا بات تک نہ کی تو اُلٹی امی سے
شکایت کی توقیر گونگی ہو گئی ہے بات نہیں کرتی۔ میں نے خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ آپ
تو غیر مرد ہیں میں آپ سے بات نہیں کروں گی تب غریب بھونچکا رہ گئے۔ میں پچھتائی
کہ ناحق کہا وہ بے چارے تو سب کچھ بھول بھال چکے تھے!"

"اللہ اُن کے حال پر رحم کرے۔ توقیر۔ آخر اب ان کا کیا ہوگا؟"

"گھر والے بھی پریشان رہتے ہیں مجھ سے بے چاری چچی جان کی حالت دیکھی نہیں
جاتی۔ بیٹے کے سامنے خود کو بے فکر ظاہر کرتی ہیں اور اکیلے میں چھپ چھپ کر روتی ہیں
سریر کب سے یہاں نہیں آئی؟"

"بہت دنوں سے یہاں نہیں آئی۔"

"چلو اس سے مل آئیں۔ پھر تین ماہ بعد امتحان ہے۔ پڑھنے لکھنے کے چکر میں
سب سدھ بدھ کھو بیٹھیں گے!"

"مگر توقیر۔!" مدحت ہچکچائی۔

"مگر نہ کچھ۔ بشیر بھائی کھا تو نہیں جائیں گے تمہیں؟" توقیر نے آنکھیں نکالیں۔

"ابھی تو کہہ چکی ہو کہ انھوں نے تمہارا ملنا گوارہ نہیں کیا تھا!"

"تنہائی میں۔!" توقیر نے شرارت سے کہا

"پھر وہی۔!" مدحت بگڑی۔

"بہت اچھی ماند د سیدھی ۔۔؟"

بڑی مشکل سے وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوئی۔

دوپہر گرم ہونے لگی تھی۔ شباہت ابھی ابھی عبیر سے مل کر گیا تھا۔ وہ اپنے باغ میں یوکلپٹس کے چھدرے چھدرے سائے میں ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ سامنے تپائی پر سگریٹ کیس اور لائٹر پڑے تھے۔ اسے کسی کی آمد کی خبر بھی نہیں لگی۔ جب توقیر نے اس کی آنکھیں بند کر دیں تو اس نے چونک کر اس کی کلائیاں جکڑ لیں۔

گرفت اتنی سخت تھی کہ توقیر کا دم ہی نکل گیا۔ کچی چوڑیاں عبیر کے ہاتھوں میں ٹوٹیں اور توقیر نے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیے۔

"توبہ اللہ..... یہ تمہاری کیسی عادت ہے!" مدحت گھبرا کر بولی۔

"آپ نے میری اتنی قیمتی چوڑیاں توڑ دیں ـ!" "نہ دعا نہ سلام ـ" توقیر بگڑ کر بولی: "دیکھئے میری کلائیوں میں کرچیں چبھ گئیں۔ خون چھلک گیا ہے!"

"میری ہتھیلیاں بھی تو دیکھئے؟" عبیر نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ سچ مچ دو تین خراشوں سے خون رس رہا تھا!

مدحت نے اپنے ڈوپٹے کا آنچل ان ہتھیلیوں پر رکھ دیا۔

توقیر شرمندہ ہو گئی: "مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔"

"معاف کر دیا!" عبیر مسکرایا: "اس لیے کہ تم اپنے ساتھ مدحت کو لائی ہو۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم آئے کیسے؟" توقیر نے اجازت لیے بغیر ایک کرسی سنبھال لی
مدحت یوں ہی کھڑی تھی اور بڑی خجالت محسوس کر رہی تھی۔

"کار سے آئی ہوگی!" وہ ہنسنے لگا: "اور کچھ، مدحت ـ ارے! تشریف رکھئے۔" پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر گھونا گھونا دھواں توقیر کے چہرے پر بکھیر دیا۔ کچھ تو اس کی ندامت کم ہوئی۔ وہ کھسیا کر بیٹھ گئی۔

کچھ پہلے آجاتیں تو اچھا ہوتا! —"

"کیوں؟" — توقیر بولی — "آپ چائے پی چکے شاید!"

"نہیں......" وہ خوشدلی سے ہنسنے لگا۔ "کیونکہ ابھی ابھی شباہت علی صاحب رخصت ہوئے ہیں......!"

توقیر پھر سرخ ہو گئی۔ مدحت کو موقعہ ملا۔ ہنس کر بولی — "آپ بہت اچھا بدلہ لیتے ہیں۔ ورنہ یہ تو مجھے ستاتے ستاتے رلا دیتی ہے!"

"یہ آپ کی زیادتی ہے۔ توقیر۔ کیا ستاتی ہیں آپ مدحت کو؟"

"کہہ دوں؟" — توقیر پھر شرارت پر تل گئی۔

"ارے وہ کچھ نہیں —" مدحت گڑبڑا گئی۔ "اس کی عادت ہی بکواس کی ہے۔"

"ہاں ایک بات اور بھی ہے!" جبیر نے کہا۔ پھر سگریٹ کا گل جھاڑتا ہوا بولا "مگر میں کہوں گا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ توقیر برا مان جائیں!"

"بالکل نہیں مانوں گی — ! کہئے نا —" توقیر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"تم جو بڑی ترقی پسند بن کر کلب جاتی ہونا؟...... وہ مجھے بالکل پسند نہیں" جبیر نے کہا۔

"نہ جایا کروں؟" — توقیر خوش ہو کر بولی۔

"نہیں! — بعض نظریے بڑی واہیات ہوتی ہیں۔ — کیوں۔ مدحت۔ تم نے کیا محسوس کیا؟"

"میں کہاں جاتی ہوں! —" مدحت نے کہا — اور آج سے توقیر سے باتیں کرتا دیکھنے لگی۔ کتنی سیدھی سادی۔ سنجیدہ اور مہذب گفتگو تھی۔ نہ اخلاق سے گرے ہوئے مذاق۔ نہ فضول قہقہے — بھلا کون کہتا ہے کہ اپنے حواسوں میں نہیں کوئی چیز ایسی نہیں جسے پاگل پن یا بدحواسی پر محمول کیا جائے۔ چہرے سے بھی ظاہر نہیں

ہوتا۔ نہ آنکھوں میں وہ وحشت اور سراسیمگی ہو جو دیوانگی سے مخصوص ہے۔ ان آنکھوں میں تو غم کے سمندر کروٹیں بدل رہے تھے۔ چاہے لب مسکراتے ہی کیوں نہ ہوں۔ قیافہ سے اُداسی برس رہی ہے ... وہ رہ رہ کر یوں کچھ سوچنے لگتا ہے جیسے بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

توقیر نے اپنی عادت کے موافق غیر متعلق فقرہ بک دیا۔ "مجھے تو آپ کی بڑی فکر رہتی ہے۔ یونیورسٹی میں آپ نے درجنوں اچھی اچھی لڑکیاں دیکھی ہوں گی اگر آپ کہئے تو ان میں سے ایک چن لوں!"

"کس لئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنے بھائی کے لئے!"

"مگر تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے!"

"آپ میرے بھائی نہیں ہیں!" وہ بڑی شدت سے بگڑی۔

"نہیں توقیر نہیں۔ بیکار تذکروں سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ کوئی اور بات کرو" اس نے کہا اور چاہا تھا کہ بجھتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگائے۔ لیکن توقیر نے پیکٹ چھین لیا۔

"نہیں اب بس۔ آدھے گھنٹے میں آپ چھ سات سگریٹ پی گئے۔"

"ہاں۔ نقصان کرتے ہیں!" مدحت بھی چپکے سے بولی۔

"تم میری بزرگ ہو یا اتالیق ہو۔ آخر کون ہو؟" عبیر نے کہا۔ "کمبخت بس نصیحتوں کا طومار باندھ رکھا ہے۔"

مدحت سہم گئی توقیر سفید پڑ گئی۔

"لاؤ مجھے سگریٹ کیس دے دو!"

"دے دو۔ توقیر۔ تم کون ہوتی ہو۔ تم تو غیر ہو" مدحت نے کہا۔ توقیر نے

کیس میز پر ڈال دیا اور دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عبیر بھی کھڑا ہو گیا۔ اور توقیر کو گھور کر بولا "تم اس طرح نہیں جا سکتیں!"

"میں جاؤں گی۔"

"میں دیکھوں گا۔ تم کیسے جاؤ گی۔"

"آپ۔ آپ زبردستی تو نہیں کر سکتے!"

"کر سکتا ہوں؟"

"ہٹیے۔ مجھے راستہ دیجیے۔"

"مجھے ہٹاؤ اپنے راستے سے!"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے جیت نہیں سکتی!"

"جیت سکتی ہو۔ بہن!" اس نے گڑگڑا کر کہا "لیکن تمہاری خفگی کا خیال۔ مجھے مدتوں ستاتا رہے گا!"

"خیال ستاتا رہے گا؟ سچ مچ۔ عبیر بھیا!" توقیر خوش ہو گئی۔

"ہاں۔ آؤ بیٹھو۔ باتیں کریں" وہ بھی ہنسنے لگا!

"آپ منّو سے باتیں کیجیے۔ میں چچی جان اور بھابی سے مل آؤں" توقیر دلی عبیر کی آنکھ بچا کر مدحت کو منہ چڑایا اور مشکتی مشکتی روش پر چل دی۔

"بڑی شریر ہے!" عبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!" مدحت بے حد خوش ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں۔۔۔ جیسے اس کے دل میں کوئی انجانا جذبہ گدگدیاں کر رہا تھا۔ پھر نہیں وہ اتنی خوش کیوں تھی۔

"اب آپ کی طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔" مدحت نے سناٹے کے طلسم سے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں ــــ تجھے کیا ہوا ہے؟" عبیر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــ آپ بہت دنوں سے ہمارے یہاں نہیں آئے!"

"کیسے آؤں۔ بیرسٹر صاحب میرا آنا جانا پسند نہیں کرتے!" اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"کون بھائی جان ــــ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ سر جھکا کر فرش گھورنے لگا۔

"یہ آپ نے کیسے جانا!"

"معلوم نہیں.... انھوں نے کہا تو کچھ بھی نہیں مگر ان کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے! ــــ جو آدمی پسند نہ ہو... گھر میں کیسے آ جا سکتا ہے مدحت؟"

"یہ تو آپ نے خود اندازہ قائم کر لیا ہے!"

"تم چاہتی ہو... میں تمھارے یہاں آیا کروں ــــ"

"جی ــــ" اب کی بار اس کا سر جھک گیا۔

"کیوں"

"آپ نہیں آتے تو اچھا نہیں لگتا!" بے ساختہ اس کے لبوں سے نکل گیا۔
اس نے سہم کر نظریں اٹھائیں۔ شاید کوئی متوقع اظہار خیال اس کے چہرے پر دکھائی دے۔ مگر وہ تو بالکل ساکت تھا! ــــ مدحت کے جذبات خیز فقرے نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا ــــ بلکہ کچھ اور سوچنے لگا: ــــ جب وہ بالکل بے خبر ہونے لگا تب مدحت پریشان ہو کر بولی "اب مجھے دیجئے۔ پیچھا نہیں۔ تو تیر کہاں رہ گئی ہے ــــ"

مدحت ــــ [illegible] ... سے کہا "جب تم ... [illegible]

ہو تو میں تمہیں دیکھ کر سوچنے لگا تھا کہ تمہیں میں نے کب دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا
تھا۔ مجھے یاد نہیں آیا ——!"

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی! —

"تم تو مجھے دیکھ کر پہچان گئی ہو گی ——"

"کیسے پہچانتی! —" وہ ہنس پڑی — "پہلی ہی بار تو میں نے آپ کو دیکھا تھا۔"

"میں سب کچھ بھول گیا۔"

وہ روش پر ٹہلنے لگا۔ اس کے انداز بڑے سنجیدہ ہو رہے تھے۔ مدحت
بھی خاموش تھی۔ ویسے اس کا دل دُکھ رہا تھا! —

"سوچو۔ شاید یاد آجائے —" دفعتہً وہ مڑا اور بڑھ کر مدحت کے کندھوں
پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کے لبوں سے سگریٹ کی خوشبو اڑی اور مدحت حواسوں
پر چھا گئی۔ اس نے جھک کر سرگوشی کی "یاد ہے تمہیں؟ — بڑا سا کمرہ تھا جس کے دروازے
پر گلاب کے پھولوں کا پردہ پڑا تھا ..... سوچو — سوچو — میں اور کون تھا۔
دیکھو۔ انکار نہ کرنا" پھر وہ ہنسنے لگا۔ خالی الذہن انداز میں "نہیں نہیں
میں تم سے کوئی انتقام نہیں لوں گا۔ اس کا خیال تک میرے دل میں نہیں آتا۔
تم صرف یہ کہہ دو کہ وہ تم تھیں ..... شاید اس الجھن کا خاتمہ ہو جائے" اس نے
اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے —"

"یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے" مدحت کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ پیچھے ہٹ
کر کھڑی ہو گئی —

"تمہارے نزدیک کسی کی موت اور زندگی کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں
کسی کو روتے تڑپتے دیکھ کر تم یوں مسکراتی ہو گی جیسے تم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے
— ظالم۔ سنگدل —"

بھنور

۔۔ ہوش میں آ گئی۔ عبیر صاحب! ۔۔ وہ اندر سمٹ گئی پھر جیسے ہی عبیر صاحب اپنا سگریٹ کیس اٹھانے کو جھکا وہ جھپٹی اس پر جھپٹنے کے لیے پینترہ بدلا ہے۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

عبیر ہکا بکا رہ گیا۔ اب وہ خود وحشت کی اس غیر متوقع حرکت کو ان لگا ہوا سا ۔۔ گھور رہا تھا جیسے وہ یک بیک پاگل ہو گئی ہو ۔۔۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ سگریٹ سلگایا اور یوں کش لینے لگا جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔

اختر صاحب ملٹری کے ڈاکٹر تھے۔ ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں کرنل کا خطاب ملا تھا۔ جب سے ریٹائر ہوئے تھے، شہر ہی میں بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ مختصر سا کنبہ تھا۔ ایک لڑکا اور بیوی پر مشتمل۔ عزیز اقارب بے شک بہت سے تھے۔ جن کی حقیقت [illegible] کرنل صاحب کو پتا تھا! انھوں نے ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا اور جب سے ان کے اکلوتے بیٹے کی دیوانگی کے قصے مشہور ہو چکے لوگوں نے خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ تین آدمی تھے اپنی بے منزل زندگی کی خار زار راہوں پر گامزن۔ کرنل صاحب کو جو فکر تھی وہ تھی۔ ان کی بیوی تو سچ مچ زندہ در گور تھیں۔ چالیس پچاس کے لگ بھگ نحیف و نزار جثہ کی خاتون تھیں ۔۔۔ آنکھوں سے غم اندوہ تری ٹپکتی تھی کوئی کشش ان کی شخصیت میں ایسی تھی کہ انھیں [illegible] سن و سال میں بھی فراموش کر [illegible]

مشکل تھا کیا کسی بیٹے نے اپنی ماں کو اتنا چاہا ہوگا جتنا تجمیر انھیں چاہتا تھا
راتوں کو گھنٹوں اٹھ کر انھیں دیکھتا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی خدمت کرنے میں
بھی اسے فخر محسوس ہوتا۔ پھر ماں آخر ماں تھی اس کی تکلیف اور جانگسل مرض کے
احساس سے پریشان ۔

انھوں نے مجبورہ بند کر آنکھوں سے بوسہ دیا۔ اور الماری پر رکھ کر آرام چیئر
پر آبیٹھیں۔ نرم نرم ٹھنڈی دھوپ ان کے پیروں پر پڑ رہی تھی۔ کندھوں کے
اردگرد انھوں نے ایک خوشنما شال لپیٹ رکھی تھی! ۔۔۔ کرسی کی پشت گاہ سے
سر ٹیک کر انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"بی بی ۔۔۔" ملازمہ نے انھیں مخاطب کیا ۔

"بچی آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ۔۔۔!" انھوں نے بیزار لہجے میں کہا۔ "
تجھے پکانا ہو۔ مغلانی بوا سے کہہ کر منگالے ۔۔۔!"

"کیا بات ہے بی بی ۔۔۔"

"کوئی خاص بات نہیں ۔۔۔" انھوں نے کہا۔ "بس ابھی پریشانیوں میں گھری
جاتی ہوں کہ ہم سب کا انجام آخر ہوگا کیا۔ وہ بوڑھے ہو گئے۔ میرا اکیلا
آئے دن کی مریض۔ ایک مضبوط سہارا اللہ نے دیا تھا ان کو۔ یہ حال ہے ۔۔۔!"

"ڈاکٹر صاحب نے تو کہا تھا بیگم کے چھوٹے سرکار کی شادی کر دی جائے ۔
خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے! ۔۔۔"

"عجیب بات ہے ۔ بیٹی ۔۔۔" وہ سیدھی ہو بیٹھیں، اور شکست خوردہ لہجے میں
ہنس ہنس کر کہا۔ "قدرت کا مذاق ۔ اب سے کئی برس پہلے دو جگہ سے رشتے
آئے۔ اور دونوں نے کپڑے نکال کر واپس کر دیے۔ کوئی لڑکی کی بیماری اور بچے کا تاریل
نظر نہیں آتی تھی اور آج یہ حال ہے کہ ترستے ہیں کسی اچھے پیغام کے لیے۔"

کہیں سے بھی آئے۔ اور کسی پس و پیش کے بغیر ہمارے لڑکے کو قبول کر سکیں۔"

"منّو باجی کیسی اچھی ہیں؟ —"

"بیکار اس کا نام لیتی ہو —" ثمینہ بیگم نے آہ بھر کر کہا۔ بڑی لاڈلی چھوٹی بہن ہے وکیل صاحب کی۔ وہ تو تذکرہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو جائیں گے۔ دیکھتی ہی ہو۔ معلوم نہیں کہاں سے بھنک مل گئی تو یہاں کا آنا جانا بند کر دیا اور امی سے بھی سیدھے منہ نہیں بولتی۔

دالان میں بھاری قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ اور دوسرے لمحے عبیر چوکھٹ پر نظر آیا۔ اس کی شکل پر نگاہیں پڑیں اور ثمینہ بیگم کے چہرے پر کچھ عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ملازمہ لڑکی اسے تکتی ہی رہ گئی۔ کیسا قد آور دلکش اور خوبرو آدمی تھا۔ مگر ذہنی طور پر بیکار —. وہ انہیں دیکھ کر کھسک گئی۔

عبیر ماں کے پہلو میں پڑی کرسی پر ٹک گیا —

"آج تمہارے پاس شباہت نہیں آئی —" ثمینہ بیگم نے پوچھا۔ انہی کے آنے سے تمہارا دل بہلتا! —

"آئے تو تھے شاید —" عبیر نے جواب دیا "کچھ یاد نہیں... شاید دوسرے صاحب تھے۔ گھنٹوں بیٹھ کر گفتگو کرتے رہے —!" پھر مسکرا کر بولا۔ "آپ میرے دل کے بہلنے کی فکر نہ کیا کیجیے امی... میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے سینے میں دل ہی نہیں ہے —"

"واہ بیٹا کیسی باتیں کرتے ہو —" ثمینہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی "سینے میں دل نہ ہو اللہ نہ کرے تو آدمی زندہ کیسے رہے گا۔"

"ارے امی — اسے زندگی کہتی ہیں آپ؟ ... —" وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑا "آپ کو معلوم نہیں۔ آپ کے نزدیک زندگی کا معیار کیا ہے۔ مگر

یہ سمجھتا ہوں کہ جو آدمی صرف کھاتا پیتا ہے اور سانس لینے کی سزا بھگتا ہے وہ بے شک دنیا میں عذاب الٰہی جھیلتا ہے۔ زندہ ہرگز نہیں رہتا۔۔

پھر وہی فلسفیوں کی سی بے تکی باتیں۔ میرے سامنے!؟ — "وہ جان بوجھ کر بگڑیں۔

"اچھا ممی" وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "اسے آپ بکواس کہتی ہیں تو لیجئے پھر کبھی نہیں کروں گا۔۔۔۔ میں تو کچھ اور کہنے کے لئے آیا تھا!"

"کافی منگواؤں—" انھوں نے پیار سے پوچھا۔ عبیر نے نفی میں سر ہلایا اور پُرخیال انداز میں کہا: "ممی مجھے یہ معلوم کر کے بے حد صدمہ پہونچا کہ ڈیڈی کی طبیعت کی وجہ سے اتنے پریشان رہتے ہیں کہ رونے لگتے ہیں۔ بتائیے نا۔ آخر مجھے ہوا کیا ہے؟ میں بیمار نہیں۔ معذور نہیں۔ پھر آپ کی اور ڈیڈی کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ کیا ڈیڈی یہ سمجھتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہے۔ کسی دن اچانک حرکت قلب بند ہو جائے گی؟"

"کیسی منحوس بدشگونی — ہے بھئی۔ اچھا ہے۔ مجھے مارنے چلی ہو!" وہ چڑ کر بولیں: "کس نے تم سے کہا ہے کہ خدانہ کرے تم بیمار ہو اور ہم سب فکرمند رہتے ہیں؟"

اچانک اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار ظاہر ہوئے اور کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا: "یہ تو مجھے بالکل یاد نہیں ممی کہ کس نے کہا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ کہا ضرور تھا اور پھر میں بھی دیکھتا ہوں — اُدھر ڈیڈی آنکھیں بند کئے صوفہ پر پڑے سوچا کرتے ہیں اور اِدھر آپ۔ کیا اس کا سبب میں نہیں ہوں ممی!"

"ارے بیٹے وہ اس فکر میں پریشان رہتے ہیں کہ سر پر ماشاء اللہ شادی کے قابل بیٹی — " نیمہ بیگم نے ہوشیاری سے بات بنا دی۔ "پڑھ لکھ چکی

یدا اس کے بڑے بھائی ہیں۔ باپ کی جگہ۔ شادی تو انہی کو کرنی ہے۔
ج کل تم جانتے ہو کہ اچھے لڑکوں کا کیا کال ہے؟.... تمھارا کوئی دوست
ہیں ہے اس قابل؟"

صرف ایک ہی تو دوست ہے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا: "اسے
نیر کی امی نے تو تنویر کے لئے پسند کر لیا ۔۔۔ ٹھیک ہے مجھے اب یاد آیا۔ غالباً کل
نام کو شباہت نے کہا تھا کہ امروز فردا میں اس کی منگنی ہے تنویر کے ساتھ۔!"
"یہ تو مجھے پتہ تھا بیٹا۔" وہ بولیں "میں کسی اور لڑکے کے لئے کہہ
رہی تھی۔"

اور کوئی کہاں ہے ممی ۔۔۔!" اس نے تاسف زدہ انداز میں کہا: "سرِر
بے حد پیاری ہے۔ اس کے قابل تو اچھا سا لڑکا ہو۔ جو اسے کوئی دکھ نہ دے!"
یمنہ بیگم بے حد سرد انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگیں: "تمہیں اس کا
حساس ہے بیٹا۔"

وہ دلکش انداز میں ہنسنے لگا۔ "واہ۔ ممی۔۔۔ بھلا کیوں نہ ہو مجھے
حساس۔ میں جانتا ہوں۔ جیسی وہ نازک۔ جذباتی اور لڑاکا ہے۔"
پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا: "آپ سے میں کیا کہوں۔ مجھ سے تو وہ کبھی
سیدھے منہ بولتی ہی نہیں۔ اس قدر لڑتی ہے کہ مجھے بولنے کا موقعہ
ہی نہیں دیتی۔ چور الگ ہے۔ کبھی جو کچھ جیب میں رہنے دیتی ہو۔ اگر میں باہر سے
ہی کوئی چیز لا کر اپنے کمرے میں رکھوں۔ بس لے بھاگے گی۔ اور اوپر سے لڑے گی
وہ اپنے لئے لائے میرے لئے نہیں لائے!۔"

یمنہ بیگم محبت بھرے انداز میں ہنسنے لگیں: "بہت ناز کرتی ہے تم پر۔"
شہریر نے چونک کر کہا: "لیجئے۔ آپ بھی۔ انگریزی ہے۔ رکھ کر دونوں ہاتھ

شیطان کا نام لیجئے اور آ دھمکے ۔۔۔!۔

"ہاں ۔ وہ دودھ پیتے بچے ہیں ۔ آپ کے جگری دوست ۔" سریرہ پاس
آئی ۔ اور ہاتھ نچا کر جلے کٹے لہجے میں بولی : "اب خواہ مخواہ پھر سے چائے بنانی
پڑے گی ۔ میں کہتی ہوں ۔ شباہت بھائی گھر سے چائے پی کے نہیں آئے ہوں ۔
ممی آپ دیکھ رہی ہیں ؟ ۔" عبیر نے شکوہ کیا ۔ ثمینہ بیگم نے سریرہ کو تنبیہ
کی : "نہ بیٹی ۔ بُری بات ۔ وہ اگر سُن لیں تو ۔۔۔"

"آپ سمجھتی ہیں ۔ میں نے سُنا نہیں ہے ! ۔" شباہت ۔
برآمدے کے چوڑے دروازے میں کھڑا سریرہ کو گھور رہا تھا ۔

"آؤ یار آؤ ! ۔" عبیر نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور پاس لا بٹھایا
شباہت نے سنجیدگی سے کہا ۔

"اچھا سریرہ ۔۔۔ اب تم بھاگو اور چائے لوازمات سمیت لے آؤ ! ۔"

"یہ پوچھ رہی تھی کہ تم گھر سے پی کے نہیں آئے ؟ ۔" عبیر نے شرارت سے کہا

"اب اپنے گھر میں پیوں گا ! ۔" شباہت نے کہا ۔ اور چٹکی بجا کر بولا ۔

"شریرہ بیگم بھاگو اب ۔۔۔ لڑکوں میں تمہارا کیا کام ؟ ۔"

"چلو چائے بنا دوں ! ۔" ثمینہ بیگم شال سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئیں ۔ "اچھا
ہوا شبو ۔ تم آ گئے ۔ اتنی دیر عبیر کا جی بہلے گا ! ۔"

"میں بھی سنوں گی ان کی باتیں ۔ بھابی ! ۔" سریرہ کھیل گئی ۔ "کیا بکواس
کرتے ہیں ۔۔ گندی فلمی چڑیلوں کی ۔۔ ۔"

"توبہ توبہ ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ ! ۔" شباہت نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ۔
"تم تو خالہ امی کو بھڑکا رہی ہو ۔ ہم شریف بچوں کا فلموں سے کیا سروکار ؟
تم البتہ بھاگتی ہو کالج سے ۔ چھوکریوں کے ساتھ ۔ ! ۔"

آپ خود چھوکرے!" سریر بگڑ کر بولی۔

"دیکھئے ممی۔ پھر شروع ہوگئی!" عبیر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"نہ بی بی۔ بری بات۔ ثمینہ بیگم نے سریر کو سمجھایا" دونوں تم سے بڑے ہیں!"

"تو پھر شبو بھیا نے میری سہیلیوں کو چھوکریاں کیوں کہا؟" وہ چیخ کر بولی

"ارے خدا کے لئے باہر چلو۔ عبیر" شباہت بوکھلا کر کھڑا ہو گیا "معلوم ہوتا ہے کہ بھول کا کانٹا الجھ کے رہ گیا ہے۔"

سریر لڑائی کے موڈ میں تھی مگر ثمینہ بیگم اسے کھینچ کے لے گئیں۔ دونوں ہنستے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔ شباہت نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "دماغ کی چولیں ہلا دیں اس لڑکی نے۔۔ اچھا یار سنو۔ آج شام تمھیں میرے ساتھ ایک دوست سے ملنے چلنا ہے۔ میں سہ پہر کو پھر آؤں گا۔ تیار رہنا!"

"اب کہاں جارہے ہو۔ بیٹھو گپ شپ کریں گے"

"تمھارے پاس تو عمر بھر بیٹھا رہتا عبیر۔ مگر یہ ملازمت کی بیڑی ایسی پاؤں میں پڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بن پڑتا! ابھی وقت کچھ لیٹ ہو جاؤں گا!"

"خالہ امی کیسی ہیں؟" عبیر نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ بالکل اچھی ہیں" وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب چلتا ہوں۔ شام کو آؤں گا!"

اتنے میں سریر دکھائی دی۔ چائے کی ننھی سی ٹرے لئے آرہی تھی۔ منہ بنا رکھا تھا۔ شباہت نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور عبیر سے بولا "بھئی ایسے مستعد اور فرمانبردار نوکر تمہیں کہاں سے مل جاتے ہیں۔ ادھر منہ سے نکلا ادھر پورا ہو گیا"

عبیر ہنسنے لگا۔ سریر نے ٹرے میز پر پٹختے پٹختے چھوڑی اور جل کر بولی۔

"زحمت نہ اٹھائیے۔ آپ چشمہ لگا لیجئے۔۔۔ قسم سے اٹھا کر پھینک دوں گی"

پوری طرح ہے!"

"اوہو تم ہو سریر.... میں قسم سے ملازم چھوکری سمجھا تھا!" شباہت گڑگڑایا۔

"چھوکری ہوں گے آپ خود!" اس نے نیلی نیلی آنکھوں سے اسے گھورا "ایک تو ہم نے ترس کھا کے چائے بنا دی ہے!"

"بہت بہت شکریہ سریر بیگم!" شباہت نے کہا۔

"پھر آپ نے میرے نام کے ساتھ بیگم کی دُم لگا دی؟" وہ پھر بگڑی۔

"ارے بڑی مصیبت ہے یار!" شباہت نے کراہ کر کہا "کسی طرح سے بھی ان محترمہ کو چین نہیں۔ چھوکری کہنے سے بگڑتی ہیں۔ بیگم بنانے سے کھانے کو دوڑتی ہیں... آخر انھیں کس طرح مخاطب کروں؟"

"بڑی مشکل ہے!" عبیر نے متفکر ہو کر کہا۔

"سیدھا سادا نام لینے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں؟" سریر نے کہا۔

"بزرگوں کا نام لینا بے ادبی ہے" شباہت بولا۔

سریر کو ہنسی آگئی۔ شباہت چائے کے بعد دونوں سے رخصت ہوا۔

اس کے جانے کے بعد سریر نے کہا "کتنے اچھے اور مخلص آدمی ہیں شبو بھائی۔ آج کل کی دنیا میں ایسے انسان کہاں ملتے ہیں۔ سب غرض کے بندے۔ سکھ کے ساتھی۔ وقت پڑے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ شبو بھائی تو تمھارے لئے روتے ہیں۔ عبیر!"

یہ سنتے ہی عبیر کا رنگ پریدہ ہو گیا۔ آنکھوں میں غیظ و غضب کی سرخی چمک اٹھی۔ اور وہ برہم ہو کر سریر کو تکنے لگا۔ پھر تلخ لہجے میں پوچھا

"کیوں ؟ ___ مجھے تم لوگ بتاتے کیوں نہیں کہ یک بیک ایسی کون سی سکرات طاری ہو جاتی ہے کہ رونا پیٹنا پڑ جاتا ہے ___ میں واقعی ایک دن اپنا سر پھوڑ لوں گا سریہ ___"

"بات کچھ نہیں اور خواہ مخواہ چڑھ دوڑتے ہو مجھ پر !۔

کرو بات ___ !" اس نے گرج کر کہا۔

"بھیا۔ تمہارے سر میں درد ہوتا ہے نا؟" سریہ چمکار کر بولی "کتنے جتن کر ڈالے کہ کسی طرح تو درد کم ہو مگر ___؟"

بکواس بند کرو۔ کسی کا درد سر کسی کے لئے اتنا موثر نہیں ہو سکتا کہ انسان خواہ مخواہ روتا پھرے۔" جبیر نے اسے جھڑک دیا "میں ڈیڈی سے پوچھوں گا ___ ! یقیناً مجھے کوئی مرض ہے۔ اور خطرناک ہے !"

ہاں اور کیا ___" سریہ پینترہ بدل کر بولی "تمہیں خطرناک مرض ہے اور ہم لوگ جلتے رہیں۔ ڈیڈی بولتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور ہر طرح خوش و خرم ہیں"

"تو پھر؟" جبیر نے سوالیہ لہجہ میں پوچھا۔

"کچھ نہیں" سریہ نے بات اچک لی "مجھے بتاؤ شنو بھیا کیوں آئے تھے؟"

"اپنے کسی دوست سے ملانا چاہتے تھے۔ تاکید کر گئے کہ شام کو تیار رہنا !"

"جاؤ گے تم ؟" سریہ نے پوچھا۔

"ضرور جاؤں گا !" جبیر نے خشک لہجے میں کہا اور باہر دیکھنے لگا۔ سریہ اسے برگشتہ دیکھ کر خاموش ہو اس کے کمرے میں کھسک گئی۔ اس کی نظر گوشہ میں بچھی ہوئی میز پر پڑی جس پر بے ترتیب نوٹ، قلم، کف لنک۔ اور جانے کیا کچھ الم غلم ڈھیر تھا! اس نے گردن اونچا کر کے جبیر کو دیکھا اور پھر جان بوجھ کر نعرہ لگایا۔

میں چاہتی ہوں کہ اب تم اپنے ہوش و حواس درست کر لو۔

"کیوں؟"

بھائی جان نے دانش صاحب کے یہاں تمہارا پیغام دیا ہے۔ اگر انھوں نے منظور کر لیا تو پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ۔!"

"نہیں!۔" عبیر بے اعتباری سے ہنسنے لگا۔

"ابھی دانش صاحب نے جواب نہیں دیا۔ اچھا۔ ابن۔ ایک بات پوچھوں۔"

پوچھو۔!" اس نے بے خیالی میں ہولے سے کہا۔

"تمھیں مدحت سے محبت ہے؟"

سریر مجھے معلوم نہیں۔ محبت کسے کہتے ہیں؟۔ مجھے محبت نے ہی تباہ کیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہیں میں بالکل کھوکھلا ہو کر نہ رہ جاؤں میرا کیا مصرف ہے؟ میں کس لیے کھاتا پیتا ہوں۔ کیوں جی رہا ہوں۔ کیوں سزا بھگت رہا ہوں۔ بتاؤ مجھے۔ سریر میں باہر کی دنیا پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ دنیا کا ہر فرد مشغول ہے مصروف ہے۔ کسی منزل تک بھاگا جا رہا ہے۔ اور میں۔ میں اسی برآمدے کی کرسی پر بیٹھے... بیٹھے صبح سے شام کر دیتا ہوں۔ میرا کوئی جادۂ عمل مقرر نہیں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ اس کارگہ عالم کا بے کار پرزہ ہوں۔ پھر میں کیوں نہیں جاتا۔ سریر۔

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اور آواز ندھ گئی۔ سریر کے دل میں عجیب عجیب سے جذبات کے جوار بھاٹے تڑپنے لگے۔ وہ اس کے سینے سے لگ گئی اور خود بھی گلوگیر آواز میں بولی۔

اس طرح نہ سوچا کرو۔ ابّن۔ آخر تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
کیا کچھ اللہ کا دیا ہوا تمھیں میسّر ہے۔ پھر تم کیوں خواہ مخواہ۔!"
عبیر کے آنسو سریر کے سر پر گرنے لگے۔ بھاری الجھی ہوئی آواز میں کہا
ڈیڈی نے کیا کچھ نہ سوچا ہو گا میرے متعلق۔ میں ان کا ایک ہی تو بیٹا ہوں۔
ان کی شکل پر نظر پڑتی ہے اور میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ میں ان کے
سامنے جاتے ہوئے گھبرانے لگا ہوں۔ مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ میں اپنے باپ
کے لیے کچھ نہیں کر سکتا.... آج ہی صبح کو میں نے ممی کا چہرہ دیکھا۔ آہ سریر۔
دکھ ان کے چہرے پر منجمد تھا۔ اتنی اداس اور پریشان دکھائی دے رہی
تھیں۔ جیسے میرا وجود ان کے لیے معدوم نہ مرحوم ہو گیا تھا۔ انھیں اب
مجھ سے کوئی توقع نہیں رہ گئی تھی۔ چونکہ وہ میری ماں ہیں۔ ان کے دل میں...
میری محبت ہو گی۔ وہ تڑپتی ہوں گی میرے لیے۔ مگر اظہار نہیں کر سکتیں
کیا میں احساس نہیں کر سکتا۔ سریر.... جب میرے محسوسات مجھے
بے قرار کرنے لگتے ہیں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں دیوانہ ہو جاؤں گا!"
دیوانے ہو جاؤ گے تو کیا کرو گے۔ ابن۔ ضبط کیا کرو۔!" سریر نے اس
کے آنسو پونچھے اور پیار سے سمجھایا" تنہائی میں بیٹھے بیٹھے سوچنا بہت برا
ہے کہیں جی لگاؤ۔ اپنے کچھ دوست بناؤ۔ تم اتنے دنوں سے کلب
بھی نہیں گئے ہو۔"
"کلب کی ہو حق تو غول بیاباں کی چیخ پکار لگتی ہے۔" عبیر نے بیزاری
سے کہا اب وہاں قدم بھی نہ رکھوں گا!"
"تو پھر میرے ساتھ گڑیاں کھیلا کرو!" سریر جھلا کر بولی۔
"ایک گیت سنو گی سریر!" اس نے دفعتہً پر خیال لہجے میں پوچھا

اور پیانو کے اسٹول پر جا بیٹھا۔ پھر پردوں پر اس کے ہاتھ چلے۔ سر یر اس کی مشاقی پر حیران تھی۔ کیسی اچھی دھن تھی۔ کیا پیارا راگ تھا۔ وہ اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ اس کے نزدیک وہ ایک معصوم بچے سے کم نہیں تھا۔ جانے وہ اسے کب سے دیکھتی آ رہی تھی۔ عبیر تو کہتا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر کھلا چکا تھا۔ وہ اب بھی ایک جان دو قالب تھے۔ بے انتہا چاہنے اور لڑنے والے۔ پھر سریر کو اس کی مجبوری یاد آئی اور وہ بے خبری میں رو نے لگی۔

دفعتہً عبیر کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور اس کے ہاتھ رک سے گئے۔

"یہ کیا ؟۔ تم رونے کیوں لگیں ؟"

وہ معصومیت سے مسکرائی "تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔ یہ اتنا سوز تمہارے گلے میں کہاں سے آ گیا۔ عبیر ؟"

"جانے سریر۔" وہ رک کر سگریٹ سلگانے لگا۔ "یہ کسی کا تحفہ ہے کسی جانے والے کا۔" وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سریر بھی کرشاں پودوں پر نکھرنے لگے گا۔ بولی۔

"ابھی تک تو تیر نہیں آئی۔ فون کیا تھا کہ آئے گی۔"

"سریر مجھے وہ گیت کیوں نہیں یاد آ جاتا۔ پھر بھی یاد آ جائے گا۔"

کیا کرو گے اس منحوس گیت کو یاد کر کے ؟" سریر چڑ گئی۔

"میں ڈیڈی سے کہوں گا کہ میرے سر کا آپریشن کر دیں۔"

"دیوانے تو نہیں ہو گئے۔ بھلا اچھی خاصی کھوپڑی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دو گے۔"

"میں سر پھوڑ لوں گا !"

میں تمھارا قیمہ بنا کر رکھ دوں گی۔" سریتا نے کہا۔ "اگر ایسی ویسی کوئی حرکت
کروگے تو عمر بھر نہ بولوں گی تم سے۔ ہاں!"

اتنے میں دروازے کے پیچھے سے نازک نازک سے پاؤں اور سفید [illegible]
کا خوشنما سا نیلا نیلا کنارہ دکھائی دیا اور وہ چھپ ہی گئی۔ پھر باہر [illegible]
توقیر نے آواز دی۔

"چلی بھی آؤ۔ توقیر۔۔۔ پیار کا مذاق [illegible] کرتی ہو۔" سریتا نے کہا۔ "دیکھو
لجو [illegible] آئی۔ [illegible] سا [illegible] بلاؤز میں بہت پیاری
لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں خوبصورت پھولوں کا حسین سا گلدستہ تھا
وہ اس نے جبیر کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ!" وہ مسکرایا۔

"اچھا اب میں چلی۔" سریتا ہنستی ہوئی بولی۔ "گھنٹہ بھر سے بک بک
کرنے سے میرا تو کلیجہ خالی ہو گیا۔" پھر مڑ کر جبیر سے بولی۔ "آپ کی میرا
جیب خرچ نہیں دیا۔"

"بس اب بھاگ جاؤ۔" وہ اسے گھور کر دیکھتا ہوا بولا۔ "ایک حبہ تک [illegible]
جیب میں چھوڑتی نہیں۔ جیب خرچ دوں گا۔ ہونہہ!"

وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ پھر جبیر نے یکبارگی ہنس کر توقیر سے کہا۔ "[illegible]
سلسلے میں مجھے معلوم ہوا تھا۔ مبارک ہو۔۔!"

توقیر کا سر جھک گیا۔ اور چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ [illegible]
وہ کچھ نہ بول سکی۔

"میں سوچتا رہتا ہوں۔" اس نے کہا پھر ٹال کر بولا۔ "بیٹھو تو خیر [illegible]
کیسے آئیں۔ تم آجاتی ہو تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

تھی آپ نے۔ یاد کیجئے!"

"تنہائی میں یاد کرنے کی کوشش کروں گا"۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"کچھ نہیں۔ آپ تنہائی میں ہمیشہ کی طرح انتقام۔ انتقام کے نعرے لگائیں گے جن ہستیوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان سے بدلہ لینے کی فکر میں اپنے آپ سے گزرے جا رہے ہیں اور جن ہستیوں کا وجود ہے۔ جو آپ کی توجہ اور دلچسپی کی محتاج ہیں ان سے بے نیاز رہیں گے۔ آخر یہ آپ نے اپنی زندگی کا کیا نصب العین بنا رکھا ہے؟"

"پھر وہی نصیحت؟" عبیر نے سر تھام لیا۔

"آپ کا منشا یہی ہے کہ لوگ آپ کو اسی حال پر چھوڑ دیں اب" توقیر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "خیر آپ کی مرضی۔ جب ہم سب کی محنت اور خلوص کا آپکو احساس نہیں۔ تو پھر ہم کیوں خواہ مخواہ آپ کی فکر میں جان گھلائیں!"

"اندازِ خفگی بھی تو میری جان گھلایا کرے ہے!!" عبیر نے بے بسی سے کہا۔

"اب میں آپ سے اسی وقت بات کروں گی جب آپ میرے گھر آئیں گے!" توقیر نے کہا۔ اور اس کے روکتے روکتے کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

اور اس دن اسے احساس ہوا۔ محبت اور ایثار کی جتنی کہانیاں وہ پڑھتی آئی تھی کتنی پراسرار، اور طلسم آسا تھی۔ کسی نے اپنے زندگی کی قربانی دینا کتنا بلند خیال ہے۔ کیا وہ بھی محبت کے اس معیار پر پوری اتر سکے گی؟! اپنے لیے جینا کوئی جینا نہیں۔ زندگی وہ ہے جو کسی کے کام آسکے۔

بڑی دیر سے مدحت اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑی پالا مارے ہوئے باغ کو دیکھ رہی تھی۔ خیالات کہیں دور پرواز کر رہے تھے۔ بار بار وہ اپنے خیالوں کو پرے ہٹاتی مگر رہ رہ کر ایک سنجیدہ اداس مگر حسین چہرہ اس کے ذہن پر چھا جاتا! وہ اسے اپنی روح کی تمام تر گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ وہ بھی پاگل ہی تھی۔

خود بخود جھینپ کر وہ مسکرائی۔ بھلا میں کیوں ڈر گئی تھی۔ افضل نے جانے اس طرح بھاگ آنے پر قہقہے لگائے ہوں گے۔ وہ تو سب کو یونہی ٹال دیتے ہیں۔ ہر ایک سے بدگمان رہتے ہیں۔ بھلا اسے کیوں اہمیت دیں گے۔ وہ تو ایک معمولی سی طالب علم تھی اور بس۔! اس کا دل مایوسی کے گہرے غار میں گرنے لگا۔ کون جانے؟ ... جب وہ سب کو بھول کے بیٹھ گئے ہیں۔ اسے بھی فراموش کر دیا ہو...

پہلے پہل اسے امید بندھی تھی۔ یقیناً عبیر صاحب کو ہار ماننا پڑے گی۔ وہ اسے جن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ مدحت سے پوشیدہ نہ تھا۔ یہ اس کی بڑا جیت تھی۔ کتنی لڑکیاں عبیر کی توجہ کی منتظر، اس سے گفتگو کے لیے بے قرار اس کی نوازش کی محتاج رہ چکی تھیں۔ یہاں تو عبیر خود اس کے پرستار تھے۔ وہ پر خلوص [illegible] آنکھوں میں اپنائیت کا احساس۔ بات چیت کا وہ انداز۔ جیسے رازداری سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ مدحت کی یہ پہلی اور آخری محبت تھی۔ گہری، خاموش اور چپکے چپکے۔ وہ عبیر کو چاہنے لگی تھی۔ اسے عبیر کی طفلانہ سادگی اور معصومیت سے بے حد پیار تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں دوسرے لڑکوں کو بھی دیکھا تھا۔ اس کے معنی خیز انداز [illegible] تھے۔ لڑکیوں سے بات کرتے تو جیسے رال ٹپک پڑتی ہے۔ [illegible]

پاتی۔ بات تو کر ہی نہ سکتی۔ جب تک بیٹھی رہتی۔ دل کے بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کیا کرتی!۔

تو قیر بڑی بے تکلفی سے اس کے پاس جا بیٹھی اور پرانے دوستوں کے انداز میں اس کی خیریت پوچھی۔ اس وقت مدحت کے دل میں بڑا حسرت خیز خیال آیا تھا کہ تو قیر کتنی خوش نصیب تھی۔ اسے ایک شاندار باوقار اور مہذب سے انسان کی رفاقت کا فخر حاصل ہے اور وہ ہے۔ خاموش، کم آمیز اور حرماں نصیب سی لڑکی۔ عجیب عجیب سی وہ تو قیر کے پیچھے بیٹھی سر جھکائے اپنے نقش دامان میں تکتی رہی۔ ہلکی ہلکی سی موسیقی ہلکی ہلکی خوشبو میں گھلی ملی فضا میں رقص کرتی رہی تھیں!۔

دفعتہ لڑکی کے ہاتھ سے اسٹک چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اور اس نے بھی چونک کر سر اٹھایا۔ پروفیسر تو قیر کی کسی بات پر ہنس رہا تھا!۔ اس کے خوبصورت دانتوں نے مدحت کو زیادہ متاثر کر دیا ایک نفسیاتی خبط اسے ہمیشہ سے تھا! ہمیشہ سے وہ اچھے ہاتھوں چمکیلے دانتوں اور مترنم و سحور کن مردانہ آوازوں کی شیدائی تھی۔ جہاں نرم و نازک لڑکیوں کے سفید سفید ہاتھ پسند آتے تھے۔ وہاں مردوں کے گندمی رنگ کے بڑے بڑے مضبوط ہاتھ بھی بڑے اچھے لگتے اب اپنی اس کمزوری سے وہ واقف تھی اور حتی الامکان کوشش کرتی کہ مردوں کے ہاتھوں کی طرف نہ دیکھے۔ مگر ان ہاتھوں نے اس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ ہی لیا جو انگلیاں ایک دوسرے سے پیوست ہو کر زانو کے اطراف بندھے تھے!۔

نہ دوبارہ مجھ سے نہیں ملیں۔ کم از کم اپنا نصاب تو پورا کر لیتیں۔ وہ بے التفات

رہی تھی۔ تو تیری زبان کو قرار کیا [illegible] معلوم نہیں کیا بکواس کیے جا رہی تھی۔

[illegible]

کسی وجہ سے عبیر اپنی یادداشت اور ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ ۔ رات کو

بڑی شدید تکلیف ہوئی تھی۔ اسے تب معلوم ہوا کہ کیوں عبیر اس قدر بھولا
بھالا اور بچوں کا سا معصوم نظر آ رہا تھا؟ اس کی محبت میں تپش پیدا ہو گئی
اور وہ ایسا سخت کسی ایثار پر آمادہ نظر آنے لگی۔ کیا کر سکتی ہے وہ اس کے
لیے؟ یونہی وہ جذباتی اور حساس تھی۔ اب تو خیالوں نے اس کا جینا
دوبھر کر رکھا تھا! عبیر کی سنجیدہ شکل و صورت۔ مہذب اطوار۔ شائستہ
گفتگو اس کی شخصیت اور ساتھ ہی اس کی دیوانگی نے مدحت کو بالکل...
اندوہ رفتہ کر رکھا تھا۔ اسے قطعی اندازہ تھا کہ وہ کسی حال میں اس کا نہیں..
ہو سکتا ہے... نہیں ہو سکتا۔ کوئی لڑکی تجربتہً خود کو پیش کرنے پر آمادہ نہ
ہوتی۔ بھلا اس کا کون سا مستقبل تھا؟ لیکن مدحت سوچتی تھی۔ کاش وہ
اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی۔ اس کے دکھ بانٹ سکتی۔ اس کے غم اپنے سینے میں سمو
لیتی۔ دنیا کی کوئی تو خوشی اسے بخش سکتی۔ یہ سوچ کر اس کا جی بھر آتا۔ گھر سے دکھ سے
بیٹھے بیٹھے سوچتی کہ شاید تنہائی میں وہ بیٹھا بے ربط سوچوں کے تانے بانوں میں الجھا
الجھ رہا ہو، سلگتا ہوگا۔ روتا ہوگا۔ اور مدحت کے آنسو بہنے لگتے۔

اسے اپنے گھر والوں کی کیفیتوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ ماں باپ تو ختم ہو
چکے تھے۔ بڑے بھائی بہت غصہ ور، سخت گیر اور سنگدل تھے۔ بھابی نے اسے ماں
کی سی شفقت دی تھی۔ اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھتی تھیں۔ مگر شوہر کے ڈر نے
انھیں مجبور کر دیا تھا وہ کسی معاملے میں خود مختار نہیں تھیں۔ بڑی دو بہنیں اور
ان کے شوہر الگ رہتے تھے سب سے بڑی بہن مزاج میں اپنے بھائی کی سی تھیں
کسی حد تک بد کلام بھی تھیں ان سے سب ڈرتے تھے۔ چونکہ وہ دولت مند
تھیں۔ کچھ نہ کچھ غرض دوسروں کی ان سے وابستہ رہتی۔ لوگ ان کی جی ہاں جی ہاں
میں ہاں ملایا کرتے۔ دونوں بہنیں اچھے عہدیداروں سے بیاہی گئی

نفیس ایک صاحب انجینئر تھے۔ دوسرے سفارت خانے میں تھے۔ ان کے پاس دولت تھی۔ عزت تھی۔ غرور تھا۔ انھیں اپنے برابر کا کوئی گھر چاہیئے تھا۔ مدحت بیاہ کر جاتی۔ وہ تو عبیر کے گھر کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرتیں اس کے گھر میں وہ پاگل، دیوانہ، خبطی اور سنجانے کن کن ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ بیرسٹر صاحب کا تو سو فیصدی یہی خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر خود کو بدحواس پوز کرتا ہے تاکہ محنت سے بچے۔ اور کرنل صاحب کی کثیر دولت کو بیٹھے بیٹھے خرچ کر سکے۔ وہ اس کا نام سننا بھی پسند نہ کرتے۔ بھلا یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ان کی سب سے چھوٹی نازوں کی پالی تعلیم یافتہ اور خوبصورت بہن ایک پاگل سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنی محبت اپنے دل تک محدود رکھی۔

سے یا سر سے کبھی نہ کہا کہ وہ عبیر سے ہمدردی محسوس کرتی تھی۔ کون جانے اس کی ہمدردی کو لوگ کن نگاہوں سے دیکھتے وہ بھی پاگل سمجھی جاتی۔ بس چپکے چپکے سلگتی رہی۔ بے جان ہوتی گئی۔ جیسے جیسے سرید سے اس کی دوستی ترقی کرتی گئی۔ وہ غیر محسوس طریقہ پر عبیر کے بھی قریب آتی گئی۔ سریدہ سایہ کی طرح عبیر کے ساتھ لگی رہتی۔ جب کبھی مدحت اس کے یہاں جاتی سریدہ اسے عبیر کے پاس لے جاتی۔ پھر ان میں کوئی حجاب نہ رہ گیا۔

کرنل صاحب ان کی بیوی اسے بے حد چاہتے تھے۔ وہ ہر اس آدمی کو جو ان کے جوان کے بیٹے کو چاہتا تھا۔ مدحت بھی بوڑھے کرنل صاحب کو اس طرح چاہتی تھی جیسے وہ اس کے باپ ہوں۔ ثمینہ بیگم کو وہ ایسی لگنے لگی اور بے پناہ محبت کرنے لگی۔ سرید تو اس کی عزیز سہیلی تھی... مگر عبیر... وہ عبیر جسے اپنی ذات سے بھی دلچسپی نہ ہو وہ دوسروں میں کب دلچسپی لیتا ہے کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ عبیر اور مدحت پاس پاس بیٹھے رہے۔ سرید کسی کام سے

دن ڈھل رہا تھا! ایک ٹھٹھرتی ہوئی بےکیف شام کائنات پر مسلط ہونے لگی تھی۔ مدحت نے نامکمل سی سانس لے کر کتاب سامنے میز پر رکھ دی۔ اور کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

منو بی بی!" گلاب نے آواز دی

اس نے بڑی کاہلی اور بیزاری سے اسے دیکھا۔

"آپ کو دلہن بیگم بلا رہی ہیں!"

"کیا کر رہی ہیں بھابی؟" وہ لباس برابر کرتی ہوئی اٹھ گئی۔

"جی کچھ نہیں..... کافی کے کمرے میں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہیں!"

بھابی اس کی منتظر تھیں۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی محیط دیکھ کر مدحت کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ان کے پاس جا کھڑی ہوئی! — مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کی۔ بھابی اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

"کیا کر رہی تھیں۔ آنکھیں کچھ روئی روئی سی لگ رہی ہیں!"

"صبح سے اب تک پڑھتی رہی بھابی!" وہ بھی اوپری دل سے مسکرائی۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا!"

"ہاں... مدحت—!" وہ پھر سنجیدہ ہو گئیں۔ "کچھ دیر پہلے کرنل صاحب کے یہاں سے چپراسی آیا تھا۔ تمہیں تھوڑی دیر کے لئے بلایا ہے۔"

"کرنل صاحب نے؟—" مدحت نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"ہاں....." انھوں نے کہا۔ "مگر مدحت..... یہ بات تمہارے بھائی جان کو معلوم نہ ہو۔ میں کرنل صاحب سے بگاڑ کرنا پسند نہیں کرتی۔ آدمی کو کب آدمی سے غرض پڑ جائے— کچھ معلوم نہیں۔ تمہارے بھائی تو بس ایک دم سے دو ٹکڑے کرنا جانتے ہیں... آج چپکے سے چلی جاؤ۔ کوئی بہانہ بنا دینا۔"

وا لیا ۔ غمگین پژمردہ اور اُداس ۔ پھر اس نے اپنی بے رُخی کا ثبوت
ثبوت دیا ۔ نہ مدحت سے اپنی شناسائی ظاہر کی نہ دعا نہ خیریت پوچھ سکا!
ایک نگاہ مدحت پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا ۔ اس کے دل پر بڑا دھکا
لگا ــ مگر وہ

گھر بھر اس کے استقبال کے لئے دالان میں موجود تھا ۔ سرور کی بڑی
بہن ۔ ان کے بچے سرور ... ثمینہ بیگم اور ان کی پرانی ملازمہ کیسا ــ
اس نے بڑوں کو سلام کیا اور جھک کے ثمینہ بیگم کے پہلو میں ٹک گئی ۔

" بہت دیر کر دی ۔ مدحت بی بی ــ " وہ اپنی نرم مگر غمگین آواز میں
بولیں : کب سے ہم سب تمہارا انتظار کر رہے تھے ۔ ! "

" طبیعت ٹھیک نہیں تھی ۔ امی ! ــ " وہ گھبرا کر بولی ۔

" کیا ہوا ــ کیا بات ہے ــ ! " سرور کی بڑی بہن نے پوچھا ۔

" جی ۔ یونہی سر درد ۔۔۔۔ ! " وہ جھینپنے لگی ۔

" نہ پوچھو بی بی ۔ درد سر نے مجھے کتنا پریشان کر رکھا ہے " ثمینہ بیگم نے کہا ۔ "
یہاں گھس کر [illegible] سے نکلیں ... اور سیکڑوں جتن کر ڈالے ۔ مگر وہ جی کا
جنجال نہ گیا ۔ خیر ہمارے لئے صبر کی جگہ ہے کہ بڑھاپے ہی سے بیماریاں لگی
رہتی ہیں ۔ مگر تم تو بچی ہو ابھی ۔ تمہیں یہ کیسا درد شروع ہوا ہے ۔ ! "

" دراصل کچھ کام نہیں رہ گیا امی ــ " وہ مسکرا کر بولی ۔ " دن بھر پڑے
پڑے کیا کروں ــ ! "

" بی بی یہاں آ جایا کرو ۔ اتنی بھی خیریت کس کام کی ہے " ثمینہ بیگم نے
محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا : تمہارے اپنے یہاں تو کوئی تمہارا
ہم سن نہیں ۔ یہاں اللہ رکھے سرور ہے ۔ محمد قمر ہے قریب قریب روز آتی ہے

ان میں تمہارا جی بہل جایا کرے گا۔ اب کیا ارادہ ہے تمہارا بی۔اے
کے بعد ——؟"

"جی ابھی تو کچھ سوچا نہیں۔ امی —!" اس نے سر جھکا کر کہا۔ اتنے میں
ملازمہ کافی اور اس کے ساتھ بہت سے لوازمات لے آئی۔ ساتھ میں سریہ
بھی تھی۔ خوب مسکرا رہی تھی۔ سلام دعا کے بغیر اس سے لپٹ گئی۔ اور شکایتوں
کے دفتر کھول دیئے۔

"ہمارے یہاں آنے سے تمہارے پاؤں کی مہندی چھوٹ جاتی ہے۔ ہزار
دفعہ بابی نے کہہ کر بلایا ہے تب کہیں تشریف لائی ہیں۔ ہم جو بھاگ بھاگ کے جاتے
ہیں تو جیسے کہ ان کے پرانے نوکر ہیں۔ اب بھی رات کا کھانا کھائے بغیر جانے
تھوڑی دوں گی ——"

"سنو تو سریہ —!" رحمت نے جلدی سے کہا۔ "میں بھائی جان سے پوچھ
کے نہیں آئی۔ مجھے دیر ہو جائے گی تو وہ معلوم نہیں کیا کہیں گے؟"
"کچھ بھی نہیں۔ تم جانے نہیں پاؤ گی آج۔ اچھا اب شور نہ کرو۔ سب
ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔" سریہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس کھسکا لیا۔
"یہ تکلف کیوں کیا سریہ —!" وہ عجیب سی بولی۔
"کاہے کا تکلف۔ کیا ہم اپنے گھر میں کھاتے پیتے نہیں؟" سریہ ہنسی۔
"بس اب زیادہ خیریت نہ برتو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈا سا سموسہ
اس کے لبوں میں ٹھونس دیا۔

تہمینہ بیگم اور سلطنت جہاں چائے پی کے اٹھ گئیں۔ سریہ نے کہا۔
"تم ذرا فراغت کر لو تو جلدی سے بھائی جان سے مل آؤ۔ وہ تمہارے منتظر ہیں۔"
"مجھے کیوں بلایا ہے۔ سریہ —؟" رحمت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اے

اللہ۔ مجھے کتنی شرم آئے گی ان کے سامنے جاتے ہوئے، کیا پوچھیں گے مجھ سے؟"
"قسم سے مجھے پتہ نہیں۔ ورنہ بتا دیتی!" سریہ نے سر ہلا کر کہا۔
پھر چائے کافی کا دور اختتام کو پہونچا تو سریہ اسے لے کر چل دی۔
اور مدحت نے ڈرائنگ روم پر پہونچ کر بولی: "بھائی جان۔ کیا ہم آ جائیں؟"
اور ان کا جواب سن کر اندر چلی گئی۔ کرنل صاحب بڑے دیوان پر لیٹے
شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر اُٹھ بیٹھے اور اخبار میز پر ڈال دیا
"آؤ بیٹی آؤ!" کرنل صاحب نے سر کے اشارے سے مدحت کے سلام
کا جواب دیتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا: "آؤ میرے پاس بیٹھو نا!"
وہ ساٹھ پینسٹھ برس کے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ جثہ بہت بڑا تھا
لیکن بالکل سن سفید ہو گئے تھے۔ چہرے سے نرم دلی عیاں تھی۔ بڑی محبت اور
نہایت شفقت سے مخاطب کرتے کہ ان کے ڈیل ڈول کا رعب مخاطب کے
دل سے نکل جاتا۔!
"کچھ چائے وائے ہماری بیٹی کے لئے؟" انھوں نے سریہ سے کہا۔
"جی ابھی ابھی چائے پی ہے۔ چچا میاں!" مدحت نے سر جھکا
کر مدھم لہجے میں کہا۔
"اچھا بی بی۔ میں ایک ضروری بات تم سے کہنے والا تھا!" کرنل صاحب
نے کہا اور پھر سگار سلگانے کے لئے رک گئے۔ مدحت سر جھکائے آنچل
کلائی پر لپیٹتی رہی۔ سریہ الگ بیٹھی نیمیا دیکھ رہی تھی۔
"شبیر کی دماغی کیفیت کا علم تو تمھیں ہو گا؟"
"جی!" اس کا سر اور جھک گیا۔
"ڈاکٹروں نے مجھے مشورہ دیا ہے اور میں خود بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں

کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ جس قدر جلد ہو سکے۔ کوئی وجہ تھی [illegible] انہیں
انہیں پریشان کر رہی ہے۔ میں نے تم کو اسی لئے بلایا تھا کہ شاید
تم کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں میری مدد کر سکو۔"

"جی ۔۔۔!" مدحت گم صم ہو گئی۔

"ہم نے سوچا تھا کہ تم ان کے لئے بہت مناسب ہو گی۔" کرنل صاحب
نے پھر کہا: "مگر اسے کسی اور نے پسند کر لیا۔ بہر حال یونیورسٹی میں اور بھی
لڑکیاں ہوں گی۔ تم بھی جانتی ہو گی۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایک کو پسند کرتا ہو۔
مدحت بیٹی!۔ اگر تم میری یہ مشکل آسان کر دو تو اپنے بیٹے کی دوبارہ زندگی
کا سب سے بڑا سبب تمہیں کو سمجھوں گا۔ مرتے دم تک تمہارا احسان نہ بھولوں گا"
ان کی آواز رندھ گئی۔

مدحت خاموش بیٹھی اپنے آنسو پی رہی تھی۔ ویسے بھی اس کے دل پر
گھونسے سے پڑ رہے تھے۔ ایک تو عبیر کا سلوک جگر کو ریچ رہا تھا دوسرے
کرنل صاحب کی گفتگو نے بے چین کر دیا۔ اب تک وہ یہی سوچتی رہی تھی
کہ شاید کرنل صاحب آسیہ کو پسند کرتے ہوں۔ لیکن وہ تو اس [illegible]
سے لڑکی تلاش کرنا چاہتے تھے۔ مدحت کیسے برداشت کرتی۔ [illegible]
دیتا آیا۔ نہ وہ کچھ کہہ سکی۔

"بہت کچھ کر کے دیکھ لیا۔ اب آخری تدبیر یہ سوجھی ہی۔ توقیر اور شبانہ بہت
میاں سے عبیر نے پوچھا تھا۔ وہ تو کہتے ہیں کہ عبیر کی توجہ کا مرکز کہیں کوئی
نہیں ہے!"

"کوئی [illegible]" مدحت نے سوچا۔ کیا وہ ایسا ہی مغرور اور لاپروا ہے؟

"مدحت [illegible]۔ تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

مدحت کیا کہتی۔ اسے تو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ بس وہ یکبارگی رو پڑی۔
"ارے بیٹی تم رونے کیوں لگیں؟" کرنل صاحب بڑے متعجب ہوئے۔ "میرا
مطلب یہ نہیں تھا۔ لیکن شریف اور بھولی بھالی بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں
تم دل بھاری کیا نہ کرو۔ ان کا مرض تکلیف دہ ضرور ہے۔ خدا نخواستہ مہلک
نہیں ہے۔ انشاء اللہ اس پر قابو پا لیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ مرض دفعیہ کے
لئے تمہارا انتظار کر رہا ہو ...!"

بڑا ذو معنی فقرہ تھا۔ مدحت کے کان جلنے لگے اور دل دھک دھک کرنے
لگا۔ مگر وہ تب بھی خاموش رہی۔

"بس بیٹی۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا!" انھوں نے کہا۔ "خیال رکھنا۔ اچھا
خدا حافظ۔"

وہ اٹھے اور کمرے سے چلے گئے! سرید اس کے پاس آ بیٹھی۔ اور
پیار سے اس کے آنسو اپنے آنچل میں سمیٹ لئے۔

"مدحتو۔ تم رونے لگیں!" سرید نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "جب تم
کچھ میں کوئی بات نہیں آتی تو میں بھی رونے لگتی ہوں۔ مگر آنسو حالات
بدل سکتے۔" مدحت ... وہ دکھ دیتے ہیں ... تم آنسو نہ بہاؤ۔ سرید بولی۔
"اگر میری زندگی ان کے کام آ سکتی تو میں دے دیتی۔" سرید نے ... مدحت
مدحت نے کہا۔

"زندگی ان کے کس کام کی؟" سرید نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
"تم سوچو مدحت کہ کون سی لڑکی ان کے لئے ایثار کر سکتی ہے؟"

"کیا میں نہیں کر سکتی؟" مدحت کا دل لبوں پر آ گیا۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔
"آؤ چلیں۔" سرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں باہر آ گئیں۔ ایک

وہاں عبیر کو دیکھ کر مدحت کا دل پھر دھڑکنے لگا! — وہ ثمینہ بیگم سے باتیں کر رہا تھا۔ آہٹ سُن کر چہرہ پھیرا۔ مگر نہ اپنائیت کا اظہار نہ مدحت کی آمد کا تاثر۔ پھر پیٹھ پھیر لی اور بدستور اپنی ماں سے باتیں کرتا رہا! — مدحت چاہتی تھی کہ اب اپنے گھر واپس جائے لیکن سریر نے اسے زبردستی ٹھہرا لیا اور اسے لئے ہوئے ثمینہ بیگم کے پاس جا بیٹھی۔ عبیر خاموش ہو گیا۔

"ابّن! —" بڑے پیار سے سریر نے پکارا۔

"ارے تجھے ذرا بھی تمیز نہیں — سریر —!" ایک طرف سے سطوت جہاں نے للکارا۔ "عبیر تم سے دس بارہ سال بڑے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کا نام لیتی ہو بلکہ برابر سے بات چیت کرتی ہو۔ بھائی — کوئی غیر سنے گا تو آپ ہی کو نام دھرے گا! —"

ثمینہ بیگم ہنس کر رہ گئیں۔ عبیر بھی کچھ نہ بولا۔ مگر سریر ڈھٹائی سے چٹخی: "ایسے کون سے میرے دادا بن گئے ہیں کہ انھیں آپ جناب سے مخاطب کروں گی۔ دو گز اونچے ہونے سے کچھ بھی نہیں ہوتا! —"

"اُن۔ اسے تم ہی نے اس قدر سر چڑھا رکھا ہے! —" سطوت جہاں نے چراغ پا ہو کر کہا: "پھر میں نہ سنوں۔ خبردار —!"

"کہنے دیجئے۔ پھوپھی۔" عبیر ہنسنے لگا۔ بڑی مایوس اداس اور پھیکی ہنسی تھی: "اس کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بڑی ہے کیونکہ رشتہ میں میری پھوپھی لگتی ہے —!"

"ارے ہاں! —" سطوت جہاں نے تعجب سے کہا: "وہ زمانہ بھول گئی جب تمہارے کندھوں پر بیٹھی گھوما کرتی تھی۔ تم اپنے پیروں پر جھولا جھلاتے تھے! —"

ان میں ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں ۔ ہنسی مذاق ۔ چٹکیاں ۔ لطیفے مگر مدحت کا دل کوئی مٹھی میں لئے رہا ۔ کیوں آخر عبیر نے اس کی طرف رُخ نہیں کیا تھا ؟ ۔ کیوں ؟ کیا وہ اسے بھول گیا ۔ وہ سب کے دکھاوے کو خواہ مخواہ ہنستی رہی مگر جی چاہتا تھا کہ خوب رو دے ..... بالآخر اس کا دل نہ لگا ۔ تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کے ساتھ ہی کئی نظریں اس طرف اٹھ گئیں ۔ ان میں استعجاب بھی تھا اور استفسار بھی ۔

"اب مجھے جانے دیجئے ۔ امی ۔۔ ؟" اس نے بے حد لجاجت سے کہا ۔ میں بھائی جان سے کہہ کر نہیں آئی ۔ آپ انہیں جانتی ہیں ۔ وہ بہت غصیلے ہیں ۔ وہ مجھ سے بہت خفا ہوں گے "

عبیر بھی اس کی طرف دیکھنے لگا تھا ۔ نجانے کیوں اس کی اور عبیر کی نگاہیں مل گئیں ۔ کیسی اداس اور عجیب آنکھیں تھیں ۔ جن میں احساسات نہیں تھے جذبات کا ہلکا سا عکس بھی نہ تھا ۔ ایک بیکراں ویرانی تھی ۔ سناٹا سا ۔ جیسے وہ مدحت کو دیکھ تو رہا تھا مگر اسے پتہ نہ تھا کہ واقعی وہ اس کے سامنے تھی ؟ کہیں دور تھی ۔ نظروں سے اوجھل ۔ اور وہ ہولناک سناٹا مدحت کو اپنی روح میں پھیلتا محسوس ہونے لگا ! یکبارگی وہ گم صم سی ہو کر رہ گئی اسے دھیان آیا ۔ اگر وہ مجھ سے اتنا کہہ دے ۔ ۔ ۔ "تم کچھ دیر کے لئے رک جاؤ ۔ ۔ ۔ میری خاطر ۔ تو وہ رک جائے گی ! ۔ خواہ اس کے لئے اُسے ایک بھائی کے قہر سے نہیں بلکہ دنیا بھر کے قہر کا سامنا کرنا پڑے ۔ مگر وہ بڑی معصومیت سے ایک ایک کا منہ تکتا رہا اور کچھ نہ کہہ سکا ۔ ۔ ۔ مسز ۔۔ مدحت کو رات کے کھانے پر زبردستی روک رہی تھی ۔ اس نے بادل ہی اس کی دعوت منظور کی اور گھر پر فون کر دیا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر کر آئے گی ۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ بارھویں شب کا چاند اپنی جنون خیزیاں
کا افسوں ساری کائنات پر پھیلا رہا تھا! خنکی بڑھ گئی تھی اور ایک بیکرانہ
سرور فضا پر طاری تھا! مدحت سب سے مل کر نیچے اُتر آئی۔ وہ نیچے جا رہی تھی
اور ادھر سے کوئی اوپر آرہا تھا وہ اسے دیکھ کر رک گیا! اور مدھم لہجے
میں کہا۔

"تمہاری گاڑی آگئی ہے!"

مدحت کو غصہ تھا وہ خاموش کھڑی رہی۔

"تم چلی جاؤ گی۔ مدحت!" وہ یک بارگی اس کے اتنے قریب آگیا کہ
اس کی گرم گرم سانسیں مدحت کو اپنی پیشانی پر محسوس ہوئیں۔

گھبرا کر اس نے پلکیں اٹھائیں اور ہولے سے بولی: "جی ....!"

اس کا چہرہ قریب تھا۔ وہ اداس آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں
جو خاموش رہتی تھیں لیکن جن کے احساسات چیختے تھے۔ وہ کوئی ایسی زبان
تھی کہ جسے مدحت کے سوا کوئی نہیں سمجھتا تھا!۔ عبیر نے کچھ اور آگے بڑھ
کر اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"سنو!" اس نے سرگوشی کی۔

وہ ڈرنے لگی۔ عبیر نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ مدحت کی تیز
سانسیں اس کے سینے میں گھٹنے لگیں [illegible] اوپر سے لوگ
اسے دیکھتے ہوئے گزر گئے اور نیچے اس کا [illegible] ڈرائیور موجود تھا ——

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا — کہ — کہ .... تم بھی رہ سکو! — اس کی آواز سرگوشی سے آگے نہ بڑھی۔

وہ دم بخود کھڑی رہی۔

"وہ دوسرا اُجالا! ایک تارہ بھی ہے میرے لئے۔ جو میری نظروں سے تمہیں اوجھل کر دیتا ہے۔ پابندیاں — پہرے — جھوٹے ڈھکوسلے۔۔۔" اس نے مدحت کا بازو جھنجھوڑ کر کہا "یہ سب کیا مذاق ہے کہ .... تمہیں مجھ سے اور مجھے تم سے ملنے نہیں دیا جاتا! —"

نیچے سے شوفر نے پھر ہارن بجایا۔

"ابھی بات ہے جاؤ —!" عبیر نے کہا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔ "میں جانتا تھا۔ جہاں اور دوسرے لوگ، دُنیا، اپنا پرایا۔ سب میرا ساتھ چھوڑ گئے وہاں تم بھی چھوڑ جاؤ گی — خبردار — اب پھر کبھی نہ دیکھنا میری طرف ان آنکھوں سے۔ جس کے پیغام کو میں جھٹلا نہ سکوں۔ خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو — سمجھا"

"سمجھتے .... آپ سمجھتے کیوں نہیں — !" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بجائے کہ تم مجھے سمجھانا چاہتی ہو۔ میں اس سے زیادہ سمجھتا ہوں۔" عبیر نے کہا اور خفگی بھری نظر اس پر ڈال کر اوپر چلا گیا — مدحت اسے بیچ اجالے میں کھوئے دیکھتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آیا اچانک عبیر کی برہمی کی وجہ کیا تھی؟ — اس نے خود ہی تو بیگانگی اختیار کی تھی! —

کب وہ کار میں جا بیٹھی اور کب گھر پہنچی؟ — بھابی نے کیا پوچھا تھا؟ وہاں دانش بھی تھے کہ نہیں — اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا۔ خود کو بہت سنبھالا۔ بہت روکا۔ اپنے سینے سے جواب کسی کو دیئے اور اپنے کمرے میں آ

دروازہ بند کر لیا۔ پھر بستر پر آلیٹی اور خون کے آنسو رونے لگی۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے ستم برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عبیر کیوں خفا ہو گیا تھا؟"

ساری رات اس نے انگاروں پر کروٹیں بدلیں۔ صبح اس کے لئے ناگوار اور بھیانک تھی۔ دو مردوں کو مطمئن کرنا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اٹھ کے خود کو دلہن کی طرح سجایا سنوارا اور طعام خانے میں آئی۔ بھابی موجود تھیں۔ بیرسٹر صاحب بھی تھے ایک ایسی نگاہ مدحت پر ڈالی کہ رہا سہا اس کا خون خشک ہو گیا۔

آؤ منو۔ بیٹھو" بھابی نے کہا "بڑی دیر کر دی" ان کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ مدحت نے اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی کہ دونوں میں اس کے آنے سے پہلے جنگ ہو چکی تھی!—

"مدحت؟—" اچانک وہ اس طرح گرجے کہ اس کے ہاتھ سے پیالی گرتے گرتے بچی۔

جی—!" سہم کر اس نے پلکیں اٹھائیں۔

"کرنل صاحب نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟" انھوں نے استفسار کیا۔ اور اس طرح بے دھڑک سوال کیا کہ وہ کوئی جھوٹ بھی نہ گڑھ سکی۔

"اگر پھر کبھی تم وہاں مجھ سے پوچھے بغیر جاؤگی تو نقصان اٹھاؤگی!" انھوں نے اسکے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "اچھی طرح سن لو۔ اور یاد رکھو میں تمھارا آنا جانا وہاں قطعی ناپسند کرتا ہوں—جب میں ان لوگوں سے میل جول رکھنا گوارہ نہیں کرتا تو تمہیں اس گھرانے سے راہ و رسم رکھنا کون سا ضروری ہے؟—"

عدالت نے اتنا عرصہ میں ایک جھوٹ سوچ لیا۔ چپکے سے بولی۔
سربد نے بلوایا تھا۔ بھائی جان ۔ وہ بی۔ایڈ کر رہی ہے۔ مجھ سے داخلہ
لینے کے لئے کہہ رہی تھی!"
"کرنل صاحب نے کیوں بلوایا تھا!"
"انھوں نے نہیں بلایا بھائی جان!"
سچ کہہ۔ رہی ہو"
"جی ہاں!"
"کیا کہہ رہی تھی سربد!"
"کہہ رہی تھی کہ کلاس میں اس کے سوا کوئی دوسری لڑکی نہیں
ہے۔ سب لڑکے ہیں اگر میں شریک ہو جاؤں تو ۔۔۔"
"بکواس ہے۔۔۔ سربد کو مصاحبت کے لئے کوئی اور لڑکی نہیں ملی!"
وہ بولے۔ پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "کرنل صاحب کی منطق الٹی
ہے۔ خود غرضی مفاد پرستی نے ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی ہے
سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی ہیں۔۔۔ انھوں نے اپنے مخبوط الحواس
بیٹے کا پیغام مدحت سے دیا ہے۔ کیا سمجھ کے دیاہے؟"
رخسانہ کے چہرے پر ناگواری کے سائے پھیلنے لگے!۔ اور مدحت کا
دل تکلیف دہ انداز میں دھڑکنے لگا!۔ بیرسٹر صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔
"میں نے مانا کہ وہ ان کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ہر قیمت پر چاہتے ہیں
کہ وہ اچھے ہو جائیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ ایک انسان کی فلاح و بہبود کی
خاطر دوسری بے گناہ زندگی کو جان بوجھ کر خراب و برباد کرنا کہاں کا انصاف
ہے؟۔۔۔ کون سا قانون ہے یہ؟۔ میں پوچھتا ہوں اگر حالات برعکس ہوتے

"کیوں محترمہ ......!" دروازے سے آواز آئی "بے موسم بارش کیسی!؟"
مدحت نے تر بتر چہرہ اٹھایا ۔ توقیر یک بیک سنجیدہ ہو گئی ۔ پاس آکر اسے لپٹا لیا ۔ اور اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے ۔

"مجھے پتہ ہے منو ...!" اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "محبت رلائے بغیر نہیں رہتی ۔ مگر اس طرح تو تم زیادہ بدہمت ہو جاؤ گی ۔ کس کا مقابلہ کرو گی آنسوؤں سے ...؟ یہ عورتوں کا ہتھیار ضرور ہے مگر زبیر مردوں پر اثر کرتا ہے بھائیوں پر نہیں ... مجھ سے بھابی نے کہا تھا کہ دانش بھائی نے تلخ ترش سنائی تھیں ...!"

مدحت نے گلوگیر لہجہ میں ساری داستان کہہ سنائی ۔

"زبیر بھیا سے وہ یونہی خفا ہو گئے ہیں ...!" توقیر بولی ۔ پھر پاس جھک کر سرگوشی کی "تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میں انہی کی بھیجی ہوئی آئی ہوں ..."

"میں ان سے نہیں مل سکتی ۔ توقیر ... انہیں میری موت کی خبر سنا دو ...!"

"بڑی خوشامدیں کی تھیں میری ۔ رات کو یونیورسٹی فنکشن کے سلسلے میں ملے تھے ۔ کہہ رہے تھے کہ کسی بہانے مدحت کو لے آؤ ...!"

"اسی طرح کہا تھا؟ ..." مدحت نے تعجب سے پوچھا ۔

"نہیں ...!"

"پھر کیسے کہا؟ ..."

"کہنے لگے وہ خفا ہو گئی ہے ۔ اگر میں اسے منا دوں گا تو یقین ملے گی ۔ میں نے مجبوری ان کے سامنے رکھی تو کہنے لگے ایسا نہ سمجھو ۔ اصرار کرتے رہے کہ تم کو کسی طرح آمادہ کر کے یہیں لے آؤں ...!"

"کاش میں توقیر بھائی ... وہ کہیں آن ملیں تو نجانے کیا حشر کریں ...!"

بھائی جان کو مجھ پر شبہ نہیں ہے۔ میں تمہیں ان کے سامنے سے لے جاؤں گی!"

مدحت کسی خیال کے زیر اثر سہمی سہمی بیٹھی رہی۔ توقیر نے اسے دلاسہ دیا۔ خدا خود بخود کوئی راہ نکالے گا۔ مگر مدحت کی نگاہ میں دنیا تاریک تھی۔ کیا کیا خواب اس نے دیکھ رکھے تھے۔ جن میں آگ لگ رہی تھی۔ دانش صاحب بڑے ضدی ہٹ دھرم اور خود رائے تھے۔ کبھی کسی کی ایک نہیں سنتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ خود بخود ان کی قلب ماہیت ہو جائے سو اس کا امکان بالکل نہیں تھا! پھر سوچتے سوچتے توقیر نے ایک راہ نکال ہی لی۔ دوسرے دن اس کی منگنی تھی۔ اس نے مشورہ دیا کہ آج کی رات اور صبر کر لے کل اس کے یہاں عبیر بھی آئے گا۔ ملنے کی سبیل ہو جائے گی! مگر مدحت خوفزدہ سی بیٹھی رہی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر توقیر سدھاری اور تاکید کرتی گئی کہ کل وہ ضرور آئے

شام کو دانش صاحب وقت سے قبل آ گئے۔ غالباً نگرانی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظریں کچھ بدگمان سی بیٹی پر بھی پڑ رہی تھیں۔ رخسانہ نے بھی سوچا کہ انھیں بدظن و برہم کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح تو کام بگڑ جائے گا۔ وہ پہلے کی سی خوش مزاج نظر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مدحت یوں بھی ان کے سامنے نہیں نکلتی تھی۔ اب تو گوشہ نشین ہو گئی۔ دانش صاحب بہت کھنچے کھنچے دکھائی دے رہے تھے۔ خاموشی سے چائے پی اور اخبار لے کر آرام کرسی پر دراز

سب کچھ سمجھ کر نہایت ناسمجھی سے پوچھا۔

"کچھ دن قبل آپ کی اور بھائی صاحب کی غالباً ملاقات ہوئی تھی!"

"جی ہاں .... لیکن نہ تو میں تنہا بھائی کی گفتگو کا لب لباب سمجھا اور نہ اب آپ کی تشریف آوری کی غایت معلوم ہوئی ہے!"

"آپ کو معلوم ہے بیرسٹر صاحب۔ کہ بھائی صاحب اپنے صاحبزادے کی دماغی علالت سے کس قدر پریشان ہیں!"

"بے حد .... اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے!"

"اللہ کے بندے بھی اگر توجہ کریں تو ایک ضعیف باپ اور اس کا نجیبہ بیٹا شاید کچھ مدت اور دنیا میں گزار لے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ بھائی صاحب کو یہ صدمہ لے بیٹھے اور خود معاذ کا نہ جانے کیا حشر ہو!"

"اگر میں کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتا ہوتا تو ضرور اس کا پتہ بتا دیتا جناب۔"

"اس قدر تجاہلِ عارفانہ اختیار نہ کیجئے بیرسٹر صاحب ... اس سلسلے میں جو کچھ آپ مدد کر سکتے ہیں وہ غالباً کوئی دوسرا نہیں کر سکتا!"

"بے شک بے شک۔ فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"معالجین کا خیال ہے کہ اگر معاذ کی شادی کر دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ جلد رو بصحت ہو جائیں۔ اکثر نفسیاتی بیماریوں کی گرہ شادی نے کھول دی ہے!"

"معالجین کے خیال کی تردید میں نہیں کروں گا۔ لیکن ضرورت جو ذرا بعید ہے جناب کو لڑکے کی دماغی کیفیت کو دیکھتے ہوئے کون ایسا بیدرد باپ یا بھائی ہے جو اپنی لڑکی تجربتہً پیش کر دے۔ یہ امر ناممکن نہیں ہے تو مشکل ضرور ہے۔ آپ مجھ سے مدد کے طالب ہیں۔ مگر میں شرمندہ ہوں

کسی ایسے خاندان کی نشان دہی سے قاصر۔ جہاں لڑکی اتنی بوجھ اور فالتو ہو کہ ایک نیم دیوانے اور فاترالعقل شخص کے علاج کے سلسلے میں بطور دوا کے استعمال کی جاتی ہے۔" اتنا کہہ کر دانش کا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا۔

"آپ سمجھے نہیں ا۔۔" ظہیر صاحب نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر دانش صاحب نے پھر بات کاٹ دی۔

"میں جانتا ہوں جو آپ کہنے والے ہیں۔ کرنل صاحب قبلہ نے اس سلسلے میں میرے یہاں پیغام دیا تھا!۔ مجھے ان حضرت کی عقل پر افسوس ہے۔ نجانے وہ کیوں کر سمجھے کہ ان کے پاگل اور خبطی لڑکے کے ہاتھ میں تم اپنی نازوں کی پالی اکلوتی بہن کا ہاتھ دے دوں گا۔ یہ ناممکن ہے شاید ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ ظہیر صاحب۔ آپس کے تعلقات کے یہ معنے نہیں کہ دوستی کا اس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں نا۔۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔ قطعی ناممکن ۔۔ میری طرف سے آپ کرنل صاحب کو صاف جواب دے دیجئے۔"

ملازم چائے لے آیا تھا! اور لئے کھڑا تھا مگر دانش کے اس طرح برافروختہ ہونے پر ظہیر پر بڑا خراب اثر ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چائے پئے بغیر کمرے سے نکل کر چلے گئے۔ دانش کا چہرہ سرخ تھا۔ ان سے شعلے نکل رہے تھے۔ آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔ بڑی دیر تک وہ ناشائستہ الفاظ میں ظہیر کو یاد کرتے رہے۔ آپ پر نظر پڑی اور دھاڑ کر کہا ۔۔ "دفع ہو جاؤ!" اس کے [illegible] نہیں گئے بلکہ وہیں ٹہلتے رہے!۔

انھیں جبیر سے ایسا ہی الٹی جنون تھا۔ وہ اس سے بے انتہا نفرت کرتے تھے۔ پہلے پہل جب انھوں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ تیز اور شریر کوئی اٹھارہ انیس برس کا لڑکا تھا۔ اور ایم۔ اے کر رہا تھا۔ پھر وہ موسیقی تعلیم کے لئے باہر چلا گیا۔ تب بھی وہ اسے ایک دولت مند بے فکر لڑکے ہی کے روپ میں سمجھتے تھے۔ پھر کوئی چھ سات سال کے بعد انھوں نے سنا کہ وہ بہک گیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ خواہ مخواہ اس سے بددل ہو گئے کہ دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پڑھ لکھ گیا ہے اپنی شخصیت کو اس طرح نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ انھیں کسی کا اعتبار نہ آتا تھا! حتیٰ کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی مشکوک رہتے۔ ان کے نزدیک وہ آوارہ تھا۔ جو موسیقی کے بہانے زیادہ سے زیادہ داد عیش دیتا تھا۔ پاگل پن کے ڈھونگ کے بہانے باپ کی بے تحاشہ دولت زیادہ سے زیادہ پھونک سکتا تھا ۔۔۔ دماغی علاج کے بہانے ملکوں ملکوں کی سیر کرتا پھر رہا تھا۔۔۔ چنانچہ وہ اس قدر نفرت کرنے لگے کہ جب کرنل صاحب نے اس کا پیغام دیا تب انھوں نے انکار کر کے ایک ناکردہ گناہ سے انتقام لیا اور بیحد خوش ہوئے۔ جبیر کی اہانت کا تصور انھیں مائل بہ تبسم کر رہا تھا۔ ان کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ مدحت کا شوہر کہلا سکے وہ تو اسے گناہ کی آلودگیوں میں بھی ملوث سمجھتے تھے۔ یہ نفرت کی انتہا تھی!

انھیں اپنی چھوٹی بہن کے محسوسات کا بھی بخوبی اندازہ تھا مگر قانون کی خشک اور منطقی کتابوں نے انھیں اس قدر تلخ، کاروباری اور اصولی آدمی بنا دیا تھا کہ عشق و محبت ۔۔۔ دل کی کہانیاں سب مہمل اور بکواس تھیں۔۔۔

وہ ٹہلتے رہے اور سوچتے رہے کہ جلد سے جلد مدحت کی شادی کہاں کر سکتے ہیں؟ جب وہ ایک فیصلے پر پہونچ گئے تو غصہ دھیما ہوا اور اندر چلے گئے۔

دالانوں میں سناٹا تھا۔ ان کے بچہ کو فلو تھا۔ رخسانہ غالباً شفاخانے چلی گئی تھیں۔ تنہا ایک ملازمہ دالان میں بیٹھی بچوں کے لباس تہہ کر رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی نگاہوں نے مدحت کو تلاش کیا جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو جھلا گئے۔

بیگم کہاں ہیں؟ انھوں نے گرج کر پوچھا۔

ملازمہ نے ہچکچاتے ادب سے کہا جی کچھ خریدنے گئی ہیں حضور۔!

بچے کو لے کر ہسپتال نہیں گئیں؟

جی صاحبزادے تو اب اچھے ہیں سرکار۔!

ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر وہ باہر مڑ گئے۔ مدحت اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے یہ دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ سامنے نہیں آئی۔ حتیٰ کہ رخسانہ شفاخانے سے واپس آ گئیں اور اپنا لایا ہوا سامان تختوں پر بکھیر کر مدحت کو آواز دی۔ وہ آئی۔ [illegible] غم مجسم سی ان کے پاس کھڑی ہو گئی نیلے لباس میں وہ بال بکھیرے وہ پہلے سے زیادہ معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ کالی کالی آنکھوں میں کوئی غم رو رہا تھا! لبوں پر ان کہی [illegible] پھیل رہی تھی۔ رخسانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا اور وہ گرتے گرتے ان کے سینے سے چپک گئی۔

منو مجھے تیرا درد معلوم ہے بہن۔ انھوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا کر سرگوشی کی۔ مگر بیٹی اپنے دکھ کو یوں ظاہر نہ کرو کہ تماشہ بن جاؤ۔

یہاں کون ہے جو دُکھ کی دوا جانتا ہے۔ جب اپنے، اپنے نہ ہوئے تو
تمہیں کس سے توقع ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں منو جو اپنے جگر پر
چھریاں چلا کر خوش ہوتے ہیں۔ تم میری بات سمجھتی ہو نا؟ ـــ میں تو
تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے۔ اللہ نے اگر چاہا تو وہی
ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ لیکن عقلمندی اسی میں ہے کہ ان سے بے اعتنائی
ظاہر کرو۔ تاکہ وہ تم سے دور نہ کئے جائیں منو۔ تمہاری وابستگی کا پتہ
اگر تمہارے بھائی کو ہو گیا تو زندگی بھر کے لئے تم ان سے دور کر دی
جاؤ گی۔ ـــ"

"بھابی ـــ ؟" رحمت نے سسک کر کہا اور ان کے سینے میں چہرہ
چھپا لیا۔

"بس زیادہ نہیں روتے۔ دیکھو میں کیا لائی ہوں تمہارے لئے۔
کل توقیر کی منگنی ہے۔ چوڑیاں، انگوٹھی اور ہار تمہارے لئے ہیں
۔۔۔۔ لباس بھی کل دوپہر تک ٹیلر دے دے گا۔ تم تو اپنی ضرورتوں
کا اظہار کرتیں نہیں۔ مجھ کو فکر لگی رہتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگیں۔ رحمت کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ
اٹھیں مگر ان کی خاطر اس نے سب چیزیں سمیٹ لیں۔ اور جب اپنے
کمرے میں آئی تب سوچنے لگی ۔۔ کیا وہ کل توقیر کی تقریب میں جا سکے گی؟

شام کے چار بج چکے تھے توقیر کی کوٹھی میں بڑی چہل پہل تھی بہت

سے مہمان آ چکے تھے۔ بہت سے آنے والے تھے۔ مگر جن کا اسے انتظار تھا وہ لاپتہ تھے۔ اس کے پاس اس کی سہیلیاں تھیں، ہنس رہی تھیں اور توقیر کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ بظاہر وہ بھی بیدلی سے ہنس دیتی مگر اس کا دماغ سُن تھا۔ وہ خیال کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ رحمت کی مجبوریاں۔ اور عبیر کی بدحواسی۔ شاید دونوں بھول کے بیٹھ گئے اور شاید دونوں نہ آئیں! — حالانکہ انہیں کو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا اس کے ہونٹوں سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور وہ خالی نظروں سے لڑکیوں کے ہجوم کو دیکھنے لگی۔

"بیوی ایسا غم کبھی نہ کرو—!" نازلی نے شرارت سے کہا: "یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بس تھوڑے ہی دنوں کی ہیں۔ پھر اللہ رکھے۔ بیگم ہو گی اور پھر—!"

"مجھے یہ باتیں ذرا اچھی پسند نہیں!—" توقیر دانت پیس کے بولی۔

"ٹھیک ہے تو پھر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ سنو—!" عمرانہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"سنا ہے کہ ایک ماہر کامیاب شکاری نے اچانک جال ڈال کر [illegible] کے لیے [illegible] مگر خود کو جال میں اُلجھا لیا"

لیکن کچھ اس پر ان کے قہقہے لگنے لگے!"

"غضب خدا کا برتاؤ—" حسینہ نے کہا: "گرانی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ نگوڑا مٹی کا تیل—!"

"بس اب چپکی ہو جاؤ۔ توقیر صاحبہ کو جلال آ رہا ہے۔ یا اللہ خیر کیجیو!" فہمیدہ بولی۔ اور توقیر جو اسے مارنے اٹھی تھی۔ اسے ایک دھکا رسید کرکے

بولی "کچھ پتہ بھی ہے — پانچ بجنے والے ہیں۔ بیٹھی کھی کھی کر رہی ہو۔ مجھے تو مدحت کی فکر ہے — ابھی تک نہیں آئی۔ حالانکہ آنا تھا اُسے سب سے پہلے! —"

"اور کیا۔ وہی تو تمہاری سسرالی عزیز رہ گئی ہے۔ باقی ہم سب کا شمار مردوں میں ہے —" نازلی جل گئی۔"

ایسی توہین تو ہم بھی برداشت کرنے والی نہیں۔ ان کی مدحت بیگم آئیں تو چلو ہم سب چلیں۔ ارے ہاں۔ مفت کی چاپلوسی۔ کون سے ہماری منگنی ہے! —" نسیمہ بولی۔

"ہر ارمان ہے نگوڑی کو اپنی منگنی کا — !" فرخندہ نے اسے تھپڑ مار کر کہا "ہر ارمان تو اب جگے ہیں۔ اب تک سوتے پڑے تھے۔" نسیمہ نے کہا "سچ تو ہے خواہ مخواہ دانت نکالے بھاگے آئے۔ ارے ہونہہ ہو۔ تو فرخندہ کو ایک میاں ملے گا۔ ہم کو کیا ملے گا! —"

"چاہو تو مل جائے گی خیرات! —" تنویر مسکرائی۔

"میاں کی؟ —" فرخندہ نے دیدے پٹکائے۔

"مار بیٹھوں گی۔ اللہ قسم — !" نسیمہ شرما گئی۔ "لو اور سنو۔ ہم کو ایسا مذاق پسند نہیں۔ بیچاری میاں والی ہو رہی ہیں۔ زبان میں موئی لگام ہی نہیں۔"

"تیرے گھر میں کون سی ایسی دادی اماں ہیں — !" نازلی نے کہا "کس سے سیکھی ہے یہ بولی۔ توبہ نگوڑی لو اور سنو —"

"ہم خود خالص نخالص مشرقی ہیں! —" نسیمہ فخریہ بولی۔

"نخالص؟ —" فرخندہ نے آنکھیں نکالیں۔

ہائے میری آنکھوں میں خاک ۔" اچانک پھر نسیمہ اچھل پڑی۔"

"ارے وہ آ رہی ہے اللہ رکھے چوتھی کی دلہن ۔۔۔ آؤ آؤ ۔۔۔
اے آمدنت باعث آبادئ ما ۔۔۔!"

توقیر اٹھ کر لپکی اور چوکھٹ ہی پر مدحت سے لپٹ گئی۔" اب آئی ہو
مہمانوں کی طرح ۔ جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے۔"

"نہ روٹھو توقیر ۔ مجھ پر رحم کرو ۔۔۔!" مدحت کے لہجے میں [illegible]
بات تھی کہ توقیر اپنا گلہ شکوہ بھول گئی ۔ اور الٹی خوشامد میں لگ گئی۔

شام ڈھلے بڑی سادگی سے توقیر کی منگنی شباہت سے ہو [illegible]
کے کھانے کے بعد مہمان رخصت ہو گئے ۔ مگر توقیر نے جبراً مدحت کو [illegible]
چاندنی رات تھی ۔ توقیر اپنی سہیلیوں کو باغ میں لے آئی ۔ [illegible]
شباہت ۔ جمیل اور چند جانے پہچانے لڑکے تھے ۔ [illegible]
گپ شپ ہوتی رہی ۔ پھر اچانک نازلی نے [illegible] سگریٹ کی [illegible]

"آپ کے دوست کی تعریف [illegible]
کیوں نہیں ۔۔۔!" جمیل [illegible]
کوئی ۔ کیا مطلب ہے ۔" [illegible]
کتنے ساز بجا لیتے ہیں ۔۔۔" مجھے تو [illegible]
نے آپ کی مہارت پر [illegible] کلب میں [illegible]
رہے تھے ۔۔۔!"

"محترمہ چار سال تک اس نے آکسفورڈ [illegible]
شباہت فخریہ لہجہ میں کالر ٹھیک کرتا ہوا بولا۔

اتنے میں نازلی نے اسے اندر سے وائلن لا کر تھما دیا۔ [illegible]

سیدھے سے انداز میں اس نے ساز لے لیا اور اس پر اسٹک پھیرنے لگا تھا ایک مرتعش دُھن ساز کے گلے سے نکلی اور فضا میں رقص کرنے لگی۔

"واہ عبیر صاحب آپ تو اس فن کے غالب معلوم ہوتے ہیں!" نسیمہ بے اختیار بول اٹھی۔

"کیسی خوب۔ محترمہ ستائش گر کوئی اگر ہو تو آپ ایسا!" ایک لڑکا بول اٹھا۔

نسیمہ نے ذرا تیکھے تیوروں سے دیکھا ہی تھا کہ عبیر نے گیت شروع کر دیا

یہ داستانِ دل ہے کہا ہر ادا زباں سے
ارمان برس رہے ہیں اب دیکھ آسماں سے

یہ ربط دو دلوں کا بے ربطیٔ بیاں سے
کچھ وہ کہیں نظر سے کچھ ہم کہیں زباں سے

یہ روٹھ روٹھ جانا ترتیب ذکرِ غم ہے
آیا ہوں انتہا پر چھوڑا تھا درمیاں سے

اس طولِ خامشی کا زورِ بیاں بھی دیکھا
تھی بات میرے دل کی نکلی تری زباں سے

ہر گام پر شکستہ ہر بار مڑ کے تکنا
او مسکرانے والے کیا ہے چلا یہاں سے

ظاہر فریب وعدہ پھر اعتبار اتنا
وہ لکھ دیا دلوں پہ جو کہہ دیا زباں سے

میدانِ امتحاں میں آئے بے غرض محبت
دل کی زمیں تو نے ٹکرا دی آسماں سے

بہت کچھ واہ واہ ہوئی۔ اس سے فرمائشیں کر کے گیت سُنے گئے۔ رات کا
شباب نکھر چلا تھا۔ شفاف نیلے آسمان پر پورے شب کا چاند ایسا تیر رہا
تھا۔ جیسے پانی پر راج ہنس۔ اکا دکا تارے مسکرانے لگے تھے۔ رات
کی رانی مہک رہی تھی۔ اور فوارے کی مدھم آواز کہیں خواب کے جزیروں
سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ فسوں خیز و سحر انگیز چاندنی میں دیر تک وہ
سب بیٹھے رہے۔ پھر لڑکیاں اور شباہت کے دوست رخصت ہو گئے
ہم چاروں بیٹھے رہ گئے۔ تب توقیر نے چپکے سے کہا

"میں ابھی آتی ہوں۔ بوا سے کافی کے لئے کہہ دوں ا—"

"جیتی رہو توقیر۔ تم نے تو تن مردہ میں جان ڈال دی۔" شباہت بولا۔

"آپ دونوں بڑے اچھے ہیں—" مدحت نے کچھ کہنے کی خاطر طنزیہ لہجے میں
کہا۔ "ابھی ابھی منگنی ہوئی۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی شرما نہیں رہا
ہے— توبہ توبہ!"

توقیر جھینپ کر مسکرائی۔ مگر شباہت ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "ارے
شرم ورم کا ہے کی۔ دیکھنا اب کیسی زوردار کافی بنا کر لاتا ہوں۔
کیوں یار عبیر؟—"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے!—" اس نے بھی ہنس کر کہا۔ "ہمیشہ ایک دوسرے
کی مدد کرنی چاہئے!—" شباہت نے توقیر کو ہولے سے اشارہ کیا اور
دونوں ہنستے ہوئے چل دیئے۔ مدحت کے لب کھل کر رہ گئے مگر نہ تو منہ
سے آواز دے سکی نہ اٹھ کر جا سکی۔ یکبارگی وہ بے جان سی ہو کر رہ گئی۔
عبیر بہت دنوں بعد اس کے اتنے قریب آیا تھا! اس کا پرکشش شخصیت
کا طلسم مدحت کے حواسوں پر چھانے لگا تھا۔ وہ جسم۔ وہ چہرہ۔ وہ خوشبو۔

جذباتی اور کمزور لڑکی اپنی توانائی کھونے لگی ۔ حالانکہ عبیر اپنی بدحواسی کی اس منزل میں تھا جہاں نہ اسے تنہائی سے فائدہ اٹھانے کا خیال آیا۔ نہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ جان بوجھ کر شباہت اور توقیر اسے مدحت کے پاس چھوڑ گئے ہیں کچھ لمحے وہ وائلن پر انگلی بجاتا رہا۔ پھر آہستہ سے مدحت کی طرف مڑا اور ایک دلکش تبسم اس کے مضبوط لبوں پر پھیل گئے — مدحت دھک دھک کرتے ہوئے ننھے سے دل کو تھام کر رہ گئی کیا کیا خیالات آئے اور گذر گئے۔ گہرے اور دیرپا سائے ڈالتے ہوئے۔ مدحت وہ از خود رفتہ سی وہ گھانس کو تکتی رہ گئی جو چاند کی نقرئی کرنوں میں زردیاں بدل رہی تھی۔

عبیر ساکت زدہ سا اسے تکتا رہ گیا۔ اپنے دلکش لباس پہنے وہ بے حد پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ جلد ہی اس کی ہو جائے گی — عبیر کا سینہ اُبھرا ہو گیا۔

وہ اس کے قریب آگیا اور اپنا بازو مدحت کے گرد حائل کر دیا پھر چپکے سے آواز دی۔

"مدحت!" اس کی بھاری اور گونجیلی آواز اس کے دل کی گہرائیوں میں جا کر نغمہ ریز ہو گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ عبیر نے پھر اسے مخاطب کیا اب اس کی سانسیں اس کے رخسار سے ٹکرائیں اور سہم کر مدحت نے پلکیں اٹھا دیں۔ وہ اس کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔ اس کا بے حد سنجیدہ چہرہ اس کے چہرے سے چھونے لگا تھا۔ آنکھیں اتنی عجیب ہونے لگی تھیں کہ مدحت کے جسم میں آگ سی پھیلنے لگی۔ اس خوشبو نے اسے مضطرب کر دیا جو اس کے لباس سے پھوٹ رہی تھیں۔ عبیر نے مدحت کی آنکھوں

میں جھانکا اور بڑی شدت سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا۔
مدحت کو احساس ہوا۔ یہاں تنہائی تھی۔ اور عبیر پاگل تھا۔
"مدحت!" — عبیر کی جذبات سے مخمور آواز میں بہت سے معنی پنہاں
تھے۔ جن کے سمجھنے میں اُسے دیر نہ لگی۔
"معلوم نہیں.. تو تیر کہاں۔ رہ گئی۔!" وہ خوفزدہ تھی —
"منو۔ تم اتنی پیاری کیوں ہو گئی ہو؟" — عبیر نے کہا۔
"منو؟" — مدحت کا دل مچلنے لگا۔ کیا اس طرح سچ مچ عبیر نے مخاطب کیا
تھا۔
"میری طرف دیکھو۔!" عبیر نے چپکے سے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اپنے
ہاتھوں کے ہالے میں اس کا چہرہ تھام لیا۔
"کیا کیجئے گا۔ مجھے دیکھ کے۔؟" اس کے ننھے ننھے لب کپکپانے لگے۔
عبیر بولے اسے یوں ہی دیکھتا رہا جیسے اس کے دلفریب حسن سے
لطف اندوز ہو رہا ہو۔ مدحت کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اس کا
دل چاہنے لگا۔ کاش زندگی یہیں تمام ہو جائے۔ ایک اجنبی چاہنے
والے کے قریب — کوئی لمحہ زندگی میں ایسا آتا ہے جب جذبات کا آخری
فیصلہ عقل اور خرد پر غالب آجاتا ہے اور عواقب کی پروا کئے بغیر بہت
کچھ کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ یہ لمحہ مدحت کی زندگی میں بھی آگیا اور
اس نے اس اجنبی انسان کے لئے اپنی زندگی تک دے دینے کا فیصلہ کر لیا
پھر وہ انجام سے بے فکر ہو گئی۔ اور بہت چپکے سے اس کے سینے پر
سر رکھ دیا۔ عبیر نے بڑے پیار سے اس کے نرم ریشمی بالوں میں اپنی
انگلیاں اُلجھا لیں۔ اور جھک کر ہونٹ اس کے بالوں پر رکھ دیے!۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے!" مدحت کے گرم گرم آنسو عبیر کا گریبان
بھگونے لگے۔

"نہیں مدحت نہیں!" اس نے بڑی گرمجوشی سے وعدہ کیا: "
زندگی کی آخری سانسوں تک تم میری ہی رہو گی۔ شاید ایک روز
آفتاب اپنی تابش کھو دے۔ ماہتاب بے نور ہو جائے۔ ستارے ماند
پڑ جائیں۔ مگر میری منو۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے
کہ میرے دل سے تمہاری یاد نکل جائے تو خدا کرے کہ سینے سے زندگی
کی رمق بھی نکل جائے۔ مدحت... مدحت... خدارا میری
ہو جاؤ!"

"بنا لیجئے مجھے اپنا...!" وہ تو اب رونے لگی تھی! "مجھے اپنے
آپ سے ساری دنیا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ دنیا میں بہت سے ظالم ہیں
اور اکیلے ہیں!"

"تم اگر میری ہو تو ساری کائنات میری ہے۔ سمجھتیں!" عبیر نے کہا۔
"آپ کو تو بھول جانے کی عادت ہے!" بے ساختہ مدحت کی
زبان سے نکلا۔

"تمہیں نہیں بھولوں گا!" اس نے [illegible] اس کی اور مدحت
کا [illegible] اٹھایا۔ عجیب کیفیت تھی۔ اب بھی دونوں کے آنسو بہہ رہے
تھے۔ عبیر کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ مدحت شرما کر رہ
گئی! اتنے میں شباہت کی [illegible] کھنکھناہٹ سنائی دی۔ وہ آ گئے
آگے [illegible] ٹرے سنبھالے آ رہی تھی۔ پیچھے نوکر تھی۔ کافی اس نے
رکھ دی۔

"بھئی مجھے تو اچانک ایک فکر لگ گئی!" شباہت نے آتے ہی کہا اور ٹرے سبزہ پر رکھ دی۔ پھر خود بھی سبزہ پر بیٹھ گیا۔ توقیر مدحت کے پہلو میں جا بیٹھی۔

"کیسی فکر؟" عبیر نے ٹرے سے ایک کاجو اٹھایا اور ہونٹوں میں دبا لیا۔

"آج ہی کی رفتار سے ہماری بیگم نے کافی بنائی تو شادی کے آٹھویں روز نوکری سے جواب مل جائے گا!" شباہت بولا۔

"امی نے شکر الماری میں رکھ دی۔۔۔!" توقیر نے یوں کہا کہ شباہت کا قہقہہ آزاد ہو گیا۔ "ارے قیامت گذر گئی یار۔۔۔!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شکر کے ڈھونڈنے میں سویرا ہونے لگتا۔ اگر امی سے پوچھتے تو وہ الگ مشکوک ہوتیں۔ شکر بازار سے خریدی اور کافی بنا کر لایا ہوں۔۔۔"

"اللہ۔۔۔ کیا کوے کے پر کا سا سچ بولتے ہیں آپ!" توقیر نے اخبار تھام لیے۔

"توقیر بڑی پیاری بچی ہے۔ اسے بدنام نہ کرو۔۔۔" عبیر نے کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں۔ وہ میری بہن ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی تمہاری گوشمالی کرنے والا ابھی موجود ہے!۔۔۔"

"مرحبا۔ مرحبا۔!" شباہت نے نعرہ لگایا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں بھی مدحت کا اسی قسم کا بھائی بن جاؤں!"

عبیر اس کا مفہوم سمجھ کر ہنسنے لگا مگر مدحت نے توقیر سے کہا۔ "ہائے اللہ۔ سنتو بیبیا کیا اب آپ میرے بھائی بنیں گے۔"

"گھلے گھلے پانی۔ منو بی بی" شباہت نے مستعدی سے جواب دیا "مگر میرا مطلب یہ تھا کہ۔ اپنے بھائی کی گوشمالی کرنے والا متحانہ ابھائی۔۔!"

"چلیے ہٹیے بڑے سادہ ہیں آپ!" مدحت نے جھینپ کر اس پر ایک بادام پھینک مارا۔

"کیسا اچھا موسم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں بیٹھی رہیں!" توقیر بولی

"یار عبیر۔ ایک نغمہ اور۔۔؟" شباہت نے کہا

"نہیں شبو۔ پھر کبھی۔" عبیر نے کف سرکا کر وقت دیکھا! "بارہ بجنے والے ہیں۔ میرے انتظار میں بے چاری ممی دروازہ کھولے بیٹھی ہوں گی کیا تم سے پھر ملنا ہوگا۔۔؟"

"میری سروس ایسی واہیات ہے کہ مشکل سے ایسے لمحات نصیب ہوتے ہیں" شباہت بھی اٹھ کھڑا ہوا "خیر چلو۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں!"

"تم منو کے ساتھ چلے جاؤ۔ وہ اکیلی ہے" عبیر نے کہا "میرے ساتھ تو شوفر ہے۔"

"اچھا بھائی خدا حافظ!" شباہت بولا۔ اور مدحت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا بھائی۔ وعلیکم السلام!" پیچھے سے توقیر بولی۔ پھر شرارت سے کہا "یہ محترمہ بھی آپ کو سلام کہہ رہی ہیں!"

عبیر نے ہنستے ہوئے دونوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا "فی امان اللہ" اور ہاتھ ہلاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ "خدا حافظ۔ خدا حافظ!!"

کچھ نہیں بھابی ..... سب اللہ پر چھوڑ دیجئے!" ظہیر یہ کہہ کر اٹھے اور کرنل صاحب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر چلے گئے۔

کرنل صاحب نے جب دیکھا کہ وہ جا چکے ہیں تو چپکے سے بولے "بڑی مدت کی جبیں سائی کے بعد پروردگار کو رحم آیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید وہ میرا ہی ہو۔ مگر یہ تو خواب تھا بیگم۔ مجھے بھی صبر کرنا چاہئے بس تو یہ دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ اور بہک چلے ہیں۔ کل شام بیٹھے بیٹھے انہوں نے اچانک مجھ سے پوچھا کہ ڈیڈی پھر وہ بارات کہاں گئی ... میں تو ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ خود کہہ کر پشیمان ہوئے اور پوچھنے لگے کہ ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے ابا۔"

ثمینہ بیگم کے مرجھائے ہوئے گالوں پر دو آبی لکیریں بن کر معدوم ہو گئیں۔

"اب آپ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دو" کرنل صاحب نے کہا "اس کی تقدیر میں صحت لکھی ہے تو ہو جائے گی ورنہ یونہی ایک دن تڑپتے تڑپتے ٹھنڈا ہو جائے گا!"

"خدانخواستہ ایسے مایوس نہ ہو جائیے۔" ثمینہ بیگم کانپ کر بولیں۔

"مایوس میں ہوں!" وہ شکست خوردہ سی ہنسی ہنسے "اب کون سی توقع باقی رہ گئی ہے بیگم۔ میں ابھی تک مایوس نہیں تھا۔ ناامیدی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن مدحت کی ذات میں روشن تھی۔ سو وہ بھی ختم ہو چکی۔ کوئی متاعِ امید مجھے نظر نہیں آتی۔ یا خدا۔ یا تو مجھے اتنی ہمت دے کہ میں ظہیر کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر صبر کر سکوں یا پھر ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دنیا سے اٹھا لے۔ بہت ہو چکا ... اب نہیں سہا جاتا ...!

"چپ رہیے۔ خدا کے واسطے چپ رہیے!" ثمینہ بیگم کا دل بیٹھنے لگا۔

اچانک کرنل صاحب اٹھ بیٹھے اور کسی خیال کے زیر اثر بولے۔

"بیگم۔ میرے ذہن میں ابھی ابھی ایک نئی بات آئی ہے۔!"

"اللہ کرے کہ وہ ہو سکے۔ کون سی بات؟"

"اگر عبیر کو منظور ہو تو اس کی شادی سریندر سے کر دی جائے!"

"سریندر کے ساتھ؟" ثمینہ بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ دونوں درحقیقت بہن بھائی ہیں!"

"ہمیں دنیا سے کیا کام؟" کرنل صاحب نے کہا۔ "تم یہ سوچو کہ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔ آپ یہ بات عبیر کے سامنے منہ سے کبھی نہ نکالیے گا۔ بہت سی باتیں اور بھی ظاہر ہو جائیں گی۔۔۔ اس کے علاوہ کہیں اس کے حواسوں پر خراب اثر نہ پڑے۔ سریندر تو صدمہ کے مارے ہوش کھو دے گی!"

کرنل صاحب خاموش ہو گئے۔

دفعتاً کمرے کے باہر عبیر کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر وہ کمرے میں آیا۔ کرنل صاحب مسکرانے لگے۔ ثمینہ بیگم نے چہرہ پھیر کر آنسو پونچھے۔ عبیر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ "کرنل صاحب! آخر کیا بات ہوئی۔ آپ لیٹے کیوں گئے۔ اٹھیے۔ مجھے آپ کے لیٹنے سے دہشت ہوتی ہے" اور اپنا سر ان کے پہلو پر رکھ دیا۔ کرنل صاحب نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائیں اور شفقت سے ہنسنے: "کرنل! عبیر!"

اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ مسرت اس سے کہیں نہیں مل سکتی
اس پر گھریلو پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ بیرسٹر صاحب کا نادری حکم
تھا۔ وہ نہ کہیں باہر جائے، نہ کسی سے ملے جلے۔ وہ کوئی احتجاج بھی
نہ کر سکی، کرتی بھی تو کیونکر۔ اس کا کون تھا؟۔ توقیر منگنی کے بعد گھر سے
کم نکلتی تھی۔ سر پر بھولے سے بھی اس کے یہاں نہ آتی۔ رحمت نظر بند تھی
اس کا کہیں جی نہ لگتا۔ دن بھر اپنے کمرے میں پڑی گھٹتی رہتی۔ ایک ایک
یاد جس کا تعلق عبیر سے تھا۔ اسے گھیرے رہا کرتی۔ ماضی کے خوشنما چراغ
رات کی تنہائی میں اجالا کرنے جل اٹھتے۔ خیالات کہیں اور کے چکر لگاتے
رہتے۔ وہ خود سے بیگانہ بن رہتی تھی۔ ساری ساری رات جاگتی اور
عبیر کے ساتھ خیالی باتیں کرتی رہتی۔ اسے توقع بندھی تھی۔ شاید ایسا
ہو جائے کہ عبیر اس سے ملنے آ جائے۔ اسے کیا پتہ نہ تھا کہ اس کے بھائی نے
تقدیر کے سب دروازے اس پر بند کر دیئے تھے۔ وہ تو یہی آس لگائے
بیٹھی تھی۔ شاید بھائی جان کا دل پسیج جائے۔ شاید وہ عبیر کو پسند کر لیں
اس کے دل کا درد [illegible] مگر تقدیر تھیں۔ ان کے [illegible] کیا بنتا؟
ایک ایک کر کے [illegible] دن گزرنے لگے۔ خود کو کھوتے کھوتے [illegible]
[illegible]
جاتا رہا۔

[illegible]

کیسے یاد کیا؟"

"م۔ مجھے..... آپ سے ضروری کام ہے!" توقیر کی سانسیں پھر سے اکھڑ گئی تھیں۔

"بس..... تم۔ فرمایئے" شباہت مسکرایا "معلوم نہیں۔ آج صبح میں نے کس کا منہ دیکھا تھا۔ آئینہ کو ہرگز نہیں دیکھا"

"دیکھئے مذاق میں نہ ٹالیے۔" توقیر نے اسے بہکنے سے روک دیا۔ "مجھے شبیر بھائی کے متعلق آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ مجھ سے کہاں مل سکتے ہیں!"

شباہت کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ لہجہ سرا سیمہ ہو گیا۔

"کیوں توقیر۔ خیریت تو ہے۔ کیا میں جاؤں اس کے پاس۔۔!"

"ایسی کوئی بات نہیں" توقیر کو اس کے خلوص کا اندازہ ہوا۔ "میں نہیں چاہتی کہ کسی کو آپ کی اور میری گفتگو کا علم ہو!۔"

"اچھی بات ہے" شباہت نے کہا "آج میں جلدی آفس چھوڑ دوں گا۔ شام کے چھ بجے تم مجھ سے بلیو ہیون میں ضرور ملو۔۔!"

"ٹھیک چھ بجے ہے۔"

"بالکل!۔" شباہت نے کہا۔ اور جب توقیر کچھ نہ بولی تو اس نے ایک منٹ انتظار کر کے ریسیور رکھ دیا اور کچھ دیر تک میں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر کرنل صاحب کی کوٹھی کے نمبر ملائے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کے کانوں میں شبیر کی بھاری اور دلکش آواز گونجی۔

"ہیلو۔ شباہت..... کیا بات ہے!۔"

"کتنی کمال ہے۔۔!" شباہت نے ہنستے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ فون پر میں ہوں"

اور میرا کون ہے۔ جو مجھے اس وقت مخاطب کرے۔۔۔؟" عمیر نے کہا۔ "فوراً میں نے پہچان لیا کہ میری خیریت دریافت کرنے والا میرے شباہت کے سوا کوئی اور نہیں۔ تم سمجھتے ہو۔ ہزار خلوص کی مہک۔ پیار کی خوشبو۔ دل سے دل کی راہ ہے۔ کیوں؟"

"بے شک بے شک!" شباہت بڑی گرمجوشی سے بولا۔ "مجھے فخر ہے تمہاری دوستی پر۔ تمہارے سوا میرا بھی کوئی دوست نہیں۔ عمیر۔۔۔ تمہیں بھی احساس ہے نا؟۔۔۔"

"کیوں نہیں۔" عمیر کی دلکش ہنسی اس کے کان میں گونجی۔ "خدا گواہ کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں تمہاری محبت کا۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔"

"اُف عمیر بس کرو۔ کہیں میں رونے نہ لگوں۔۔۔!" شباہت کی آنکھیں بھیگنے لگیں پھر اس نے ہنس کر گلا صاف کیا۔ "اچھا بتاؤ۔ کیا کر رہے تھے اس وقت؟"

"اگلے ہفتے پرنس کلب میں میوزیکل کنسرٹ ہو رہا ہے۔ وہیں ترتیب دے رہا تھا!"

"دل تو نہیں گھبراتا!"

"آہ۔۔۔ دل کی بات نہ کرو۔ دل گیا ساری کائنات گئی۔ یہ فسانہ بہت پرانا ہے۔" عمیر نے کہا۔ "میں بھول گیا کہ میرے سینے میں دل نام کی کوئی چیز بھی ہے۔ انسانی جسم کی مشینری میں یہ بھی ایک پرزہ ہے جو انسان کو متحرک رکھتا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کا کام دھڑکنا ہے اور بس۔۔۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے پاس نہ آؤں!"

"میرا مطلب ہے کہ تم میرے پاس سے کبھی نہ جاؤ۔۔!"

اچھا اچھا۔۔۔! " شباہت بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ عبیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مگر اس نے یہ نہیں پوچھا کہ بے مقصد شباہت نے اسے کیوں مخاطب کیا تھا؟ شباہت اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے جلد ملنے کا وعدہ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا ورنہ عبیر شام تک یونہی رسیور تھامے کھڑا رہتا۔۔

وہ پھر آکر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ شباہت کی پُرلطف باتوں پر کچھ دیر خود بخود مسکراتا رہا اور پھر کلاریونٹ اٹھا لیا۔ اور مختلف دھنیں بجاتا رہا۔ یکایک کسی نے پشت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو۔ ابّن!" سریر بڑے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

عبیر کی ہنسی اس سے کہیں زیادہ پُرمحبت تھی۔ جھک کر اس نے اپنے لب سریر کے ہاتھ پر رکھ دیئے پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سریر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ کیسی خوشنما آنکھیں کیسی محبت جھلک رہی تھیں کہ سریر اس میں کھو گئی!۔۔۔

"بتائیے تو چچا جان۔ میں آپ کو کیوں اچھا لگتا ہوں!" وہ ہنسنے لگا!۔۔۔۔

"تم ہی کو اچھے لگتے ہو۔" سریر نے اس کے ماتھے پر اپنا رخسار رکھ دیا "تمہارا نام۔ تمہارا چہرہ۔ تمہاری آواز۔ کون سی چیز تمہاری اتنی سے جدا اچھی نہیں ہے۔۔ تم شہزادے ہو عبیر ایک شہزادے۔۔

خوبصورت ۔ خوب سیرت ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔!"

"اور بہت زیادہ بدقسمت!۔۔" عبیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی بات پوری کر دی۔ پھر وہ ہی ۔۔" سمیرا اس کے سامنے آ بیٹھی" میں بتاؤں۔ بھتیجے ...تم سا خوش نصیب تو اب دنیا میں نہ ہوگا!۔۔"

"اب؟ ۔۔۔ کیوں؟ ۔۔۔ !" وہ بھی سیدھا ہو بیٹھا۔

"تم منو سے محبت کرتے ہو نا؟ ۔۔۔"

"اگر میں کہوں کہ کرتا ہوں تو کیا مجھے سزا دی جائے گی!۔۔"

"ایک کڑی سزا ۔۔" سمیرا نے شرارت سے دیدے نچا کر کہا۔

"بامشقت؟ ۔۔" عبیر نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ۔۔" سمیرا بولی "تمہیں جس سے محبت ہے۔ وہ عمر بھر کے لئے تم سے وابستہ کر دیا جائے گا!۔۔"

"نہیں!۔۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"آخر تمہیں کیوں نہیں یقین آتا ہے؟" سمیرا تیز لہجے میں بولی۔ "سچ مچ!۔۔"

عبیر پر مسرت لہجے میں بولا ۔۔ "سچ مچ ۔۔۔!" اور ہنسنے لگا!

ناول اتنا اچھا نہیں جتنا کہ مشہور ہے!

شام کے چھ بجے ہوٹل ہیومیون کی رونق زندہ تو تھی مگر اپنے شباب پر نہیں تھی۔ بہت بڑا اور ترقی یافتہ ترقی پسند ہوٹل تھا۔ اور [illegible] کی تمام ضروریات سے آراستہ۔ شب ہشت بام کے کمرے کے پیچھے بڑا ...

انداز میں گزرتی اور ٹھہرتی ہوئی سواریوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر کف ہٹا کر
کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظریں دوڑاتا۔ خدا خدا کرکے سوا چھ بجے ایک پردہ دار
رکشہ سے توقیر اتری۔ بے ساختہ شباہت کی زبان سے نکلا — "توقیر —
اس طرف! —"

اس نے ساڑھی کے آنچل سے خود کو اچھی طرح چھپا لیا۔ شباہت سب
انجانی دلچسپیوں میں گم تھے کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی مگر توقیر جب تک
الگ تھلگ کیبن میں پہنچ کر اطمینان سے نہ بیٹھ گئی مضطرب رہی۔
شباہت اس کے پاس بیٹھا کوئی نہایت اہم یا دلچسپ خبر کا منتظر تھا —
آخر اس سے نہ رہا گیا۔ توقیر کی طرف تکتے ہوئے پوچھا "ابھی ابھی ایسا
..... کیا بات ہے۔ توقیر؟ —" ابھی وہ جواب نہ دے سکی تھی کہ ویٹر پردہ
ہٹا کر اندر آگیا — شباہت نے دو تین چیزوں کا آرڈر دے کر اسے
بھگا دیا۔ توقیر چپ لیے سانسیں درست کرتی رہی۔ پھر جلد جلد ساری
تفصیل اسے بھی سنا دی۔ شباہت کنپٹی پر انگلی بجاتا اور سوچتا رہا۔

"بیرسٹر صاحب کے ساتھ سر کھپانا اور لوہے کے چنے چبانا یکساں ہے
توقیر! —" اس نے مدھم پُرتفکر لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے کہ سورج
مغرب سے طلوع ہو جائے مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک بات کہہ کر اس سے
پھر لیں۔ میں انہیں خوب جانتا ہوں ..... ماموں جان کے مقدمہ کی پیروی
انہوں نے کی تھی۔ اور کسی بحث پر یوں جم کر لڑے تھے کہ فریق مخالف کے
وکیل کو رلا رلا دیا تھا! —"

"بیرسٹر صاحب چاہے جیسے بھی ہوں۔ آپ یہ سوچئے کہ سوال اپنی بقا
اور مسرت کی زندگیوں کا ہے —" توقیر نے کہا "میں دونوں کے دلی کا

حال جانتی ہوں۔ مدحت تو رو رو کر پاگل ہو جائے گی! اور عبیر بھیا
غالباً غصے کے مارے آپے سے گزر جائیں!۔۔"

"انھیں کس نے خوش فہمی میں مبتلا رکھا ہے۔۔!" شباہت نے کہا
"میری رائے تو یہی تھی کہ کوئی فیصلہ اچھا ہوتا کہ برا۔ عبیر سے کہہ دیا جاتا
انھیں امید میں مبتلا رکھ کر ناامیدی کا پیغام سنانا ان کے ساتھ بد دیانتی
کرنا ہے۔۔۔ جب کہ ان حالات میں۔۔۔!"

ویٹر مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ شباہت نے ساری چیزیں توقیر کے
سامنے سرکا دیں۔ وہ جھینپنے لگی۔ شباہت نے ویٹر سے کہا: "آپ اپنی
سروس پہ جائیے۔ ہم آواز دے لیں گے!۔۔" وہ معنی خیز انداز میں
مسکرا کر اور سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

"یہ تکلف آپ نے کیوں کیا؟۔۔" توقیر بولی۔
"یہ تکلف آپ کی خاطر کیا۔۔۔" شباہت نے ہنستے ہوئے کہا۔"
بس توقیر شروع کرو۔ ہم میں ایسی رسمی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔۔۔۔!"
چند منٹ وہ خاموش رہے۔ توقیر بہت تکلف سے کام لے رہی تھی۔
کافی کے بعد وہ پھر اُسی موضوع پر آ گئے۔

"آپ نہیں سمجھا سکتے بیرسٹر صاحب کو؟۔۔" توقیر نے پوچھا۔
"سمجھانے کا اثر ان پر برعکس ہوگا۔ وہ اپنے فیصلے میں پختہ ہو جائیں گے!"
"تو پھر۔۔۔!"
"میں بے چارے عبیر کو سمجھاؤں گا کہ جہاں اس نے ناکامیوں کے اتنے
صدمات جھیلے ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی سہی۔ ایسا کون سا فرق پڑے
گا۔ اس بد نصیب نے اپنی یادداشت میں کونسی خوشی حاصل کی ہے۔ غریب

مظلوم۔ میرا دوست ۔۔ مظلوم نہیں ۔۔ کب خدا کو اس پر رحم آئے گا!

"ان سے نہ کہئے۔ بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بچے کی طرح خوشی اور غم کے تاثرات قبول کرتے ہیں۔ ذرا سی بات پر خوش ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ ویسے ہی جلدی سے ان کے آنسو بھی چھلکنے لگتے ہیں۔ کاش۔ بیرسٹر صاحب کا دل پلٹ جائے!"

"کوشش تو میں ضرور کروں گا" شباہت نے کہا "خدا کرے نہ دونوں جانیں.... کچھ تم نے اندازہ لگایا۔ وحدت بھی عبیر کو پسند کرتی ہے؟"

"پسند؟ ۔۔" توقیر نے آنکھیں اٹھا کر شباہت کو دیکھا وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کی آنکھوں میں توقیر کو کیا نظر آیا۔ اس نے یکبارگی سرخ ہو کر پلکیں جھکا لیں اور پھر خشک لبوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی "صرف پسند نہیں ۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ ۔۔ وہ تو ۔۔۔ جان چھڑکتی ہے۔ عبیر بھائی پر ۔۔ ! اسے کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ انہیں خدانخواستہ دیوانہ کہتے ہیں"

"میرے دل پر آرے چلتے ہیں۔ توقیر ۔۔ !" شباہت کی آواز بھرا گئی "جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ یکبارگی فلسفہ بولنے لگتے ہیں۔ بے وجہ ہنستے ہیں۔ بے معنی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہجوم میں خود کو تنہا سمجھ کر انتقام انتقام چلانے لگتے ہیں ۔۔۔ اف فوہ ۔۔ میں تم سے کیا کہوں توقیر۔ وہ کیسا آدمی تھا بے انتہا سنجیدہ ۔ بے انتہا مہذب ۔۔ خدا نے کیا کچھ پڑھا لکھا ہے۔ کہاں کہاں کی سندیں حاصل کی ہیں۔ ہر محفل کی جان تھا ہر بزم کی روح رواں۔ اس کے بغیر سب کچھ سونا سونا ہوتا تھا۔ وہ ک

پروانوں کی طرح اس پر گرتے تھے ... مگر وہ بے نیاز تھا۔ نہ شہرت کی آرزو تھی نہ دولت کی پرواہ ۔۔ نہ اس نے کبھی اپنے قریب لڑکیوں کو پسند کیا نہ پرستاروں کو گوارہ کیا۔ کیا بتاؤں توقیر۔ وہ منفرد تھا۔ آہ۔ شاید ۔۔ قدرت و تقدیر تاک کر ایسے ہی لوگوں کو ہدف ستم بناتی ہے!۔۔" وفور گریہ نے اسکی آواز بند کر دی۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر کہا "اور اب کیا ہے؟ ۔۔ بے کار، بے مقصد، بے مصرف آدمی۔ جس کا کسی محفل و انجمن میں کام نہیں ... آہ میرے اللہ کیا تیری نادر روزگار تخلیق کا یہی انجام تجھے پسند ہے۔ اُف۔ اُف۔ بخدا یہ ظلم ہے"

توقیر کے تو آنسو گر رہے تھے۔ شباہت نے اپنے آنسو رومال میں پونچھ لئے۔ اور کھنکھار کر کہا "خیر۔ جو مرضی مالک کی۔ اس سے کون لڑ سکتا ہے۔ میں تو صرف اس کی صحت کی دعا ہی کیا کرتا ہوں۔ تم بھی دعا مانگو۔ شاید خدا اس کے حال پر رحم فرمائے۔" جب گفتگو ختم ہونے لگی تو وہ پھر بولی۔ "آپ سمجھا دیں گے نا دانش صاحب کو!..."

شباہت نے پُر زور وعدہ کیا۔ اور اٹھ گیا۔

"چلو میں تمہیں چھوڑتا ہوا جاؤں گا۔ عبیر کے پاس جانا ہے۔" توقیر ساتھ ہو لی۔ دونوں اتنے دلگرفتہ اور مغموم تھے کہ اپنے مستقبل کی بھی کوئی بات نہ کی۔ راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ وہ قیمتی جانیں کس طرح تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔ پھر توقیر کو اس کے مکان پر اتار کر شباہت اپنی گاڑی آگے نکال لے گیا۔۔

عبیر کے پاس اس کی بڑی پھوپھی سطوت جہاں کے بچے تھے۔ سر پہ تھی بڑا شور مچا ہوا تھا۔ شباہت کو دیکھ کر یک لخت خاموشی چھا گئی۔ اکیلا

۔ جبیر پُرمسرت آواز میں بولا "اوہو۔ شباہت تم آگئے۔ آؤ بھئی آؤ۔"
تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ محترمہ پھوپھی اماں صاحبہ!" اس نے جھک کر بڑے ادب سے سریر کو سلام کیا۔ آسے ستانے کے لئے سریر کو پھوپھی اماں کہتا تھا اور وہ خوب خفا ہوتی تھیں۔ بگڑ کر بولی "بڑے ننھے منے بھتیجے بن کر آئے کہیں سے!"

"ہائیں ہائیں" شباہت کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا "سلام کے جواب میں نہ دعا نہ بدعا بس لڑنا شروع کر دیا۔ پھوپھی اماں۔ آپ کی یہ عادت ہم سب بچے بھی سیکھ لیں گے!"

"اور کیا۔ پانچ برس کے بچے ہیں آپ!" سریر بولی۔

"ساڑھے پانچ برس!" شباہت نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا! "آپ ماشاءاللہ پچپن سال سے کم نہیں ہیں!"

"شباہت بھائی دیکھئے میں کہے دیتا ہوں۔ پھر غصے میں میرے منھ سے کچھ نکل جائے گا۔ برا نہ مانئے گا!" سریر نے آنکھیں نکالیں۔

"کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا" شباہت عاجز آکر بولا "دوست کی پھوپھی سب کی پھوپھی۔ بھتیجے، بھتیجے برابر۔ آپ کو تو چاہئے کہ بڑی شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر پھلنے پھولنے کی دعا دیں۔ جیسی میں آپ کو دیتا ہوں کہ اللہ کرے خوب گورا چٹا پھوپھا جان ملے اور...."

"اور یہ کہ آپ بے تحاشہ خراب آدمی ہیں" سریر نے دانت پیس کر کہا "میں آپ سے بات نہیں کرتی!" یہ کہہ کر اس نے اس کے سیدھے سیدھے ہوئے بال بکھرا دیئے اور ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ بچے جو اس کی لڑائی سے لطف لے رہے تھے وہ بھی ہنستے تالیاں بجاتے اس کے پیچھے

دوڑ گئے۔

شباہت نے ہنستے ہوئے کہا: "اس کا بچپنا کبھی نہیں جائے گا
عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ ابھی کل تک میرے سامنے نیکر اور فراک پہنے
دن بھر اچکا کرتی تھی۔ اب سنجیدگی سے برا مانتی ہے۔ خیر — تم اپنا کہو
کیا حال احوال ہے؟"

"درویشوں کا حال احوال کیا" عبیر نے ہنس کر جواب دیا: "اب
تو آرام سے گزرتی ہے ۔۔۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں۔!"
اس کی آواز میں درد اور لہجے میں تلخی تھی۔

"زندگی کا کوئی نصب العین بناؤ۔ عبیر!"

"وہ تو خدا نے سب کا بنا دیا" عبیر نے زیادہ تلخ لہجے میں کہا: "ایک
مختصر سا عرصہ حیات۔ چند روزہ جسم کی سزا۔ عمر بھر کا گریہ و نالہ۔
پھر کوئی انجانی بیماری۔ بستر مرگ۔ اور پھر اجنبی کندھوں پر آخری ہولناک
سفر ۔۔۔ مجھے بتاؤ۔ شباہت۔ کسی انسان کی سوانح عمری اٹھا کر دیکھو
ناکام تمناؤں۔ کچھ کرنے کی حسرتوں۔ اور نہ کر سکنے کے غموں سے بھری
ہوگی۔۔۔ آدمی کی زندگی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ صرف پچاس سال۔ اسی
پہلا حصہ روتا ہے اسی میں خود کو بہلاتے گزرتے ہوئے آتی ہے۔ لڑکپن کے
تو اب آنسو اور دور سے گزرتا ہے۔ شباب اُمنگوں آرزوؤں کے فریب میں اُلجھا
رہ کر بھٹکتا ہے۔ پھر وہی انجام۔ مرگ و گور ۔۔۔!"

اس بھیانک طریقے سے سوچتے ہو عبیر کہ میرا کلیجہ بھی پانی پانی کر
دیتے ہو۔ شباہت نے جواب دیا: "اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو
اس دنیا کی گاڑی کیسے بڑھے گی۔؟"

"خدا کی دنیا کو اس کے خود فراموش بندے آگے بڑھاتے رہیں گے
... دنیا کو ٹھکرانے والا کو تم تو صرف ایک ہی ملے گا!.. خدا نے اپنا
... تصور رکھنے والا خود ہی سوچ لیا ہے... وہ بے نیاز اور
... اد ہے — میرے دوست — ایک گوتم اگر راج پاٹ کو چھوڑ
کر خدا کی تلاش میں جنگلوں کی طرف بھاگ جائے تو خدا کو اس کی فکر نہیں
ہوتی —" آج وہ بے حد تلخ اور بےمزہ ہو رہا تھا! — شباہت نے
غور سے اس کی شکل دیکھی اور کچھ سوچ کر موضوع بدل دیا۔ یک بیک
خوش ہو کر بولا: —

"تم نے سنا نہیں — ! خالہ اماں کو حج پر جانے کی اجازت مل
گئی ہے۔ اب انشاء اللہ وہ چلی جائیں گی! —"

واقعی؟ —" اس نے اپنا سارا فلسفہ بھول کر پوچھا۔ شباہت نے
ہنس کر گردن ہلائی۔

"میں بہت دنوں سے ان سے نہیں ملا" جمیر نے کہا: اگر تم کو فرصت ہو
تو چلو چل کر مل آئیں"

"مجھے تو بابا شرم آتی ہے ان کے یہاں جاتے ہوئے۔ !" شباہت
نے کہا: —

کیوں؟ —"

اب یہ تم سوچو کہ کیوں؟ —

ٹھیک ہے۔" وہ ہنس پڑا۔ "وہ تو قیری امی ہیں... اس لئے؟ —"

"ہاں بھئی۔ نجانے کیا کیا خاطریں کرنے لگتی ہیں... بڑا حجاب معلوم
ہوتا ہے —"

اچانک عنبر کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا: "بہت اچھی خاتون ہیں۔ توقیر بھی بہت پیاری بچی ہے۔ بڑوں کا کہا مانتی ہے۔ میں نے اسے کلب جانے سے منع کیا تھا۔ مان گئی۔ خدا کرے کہ اس کی وجہ سے تمہاری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں آجائیں —"

"کوئی خوشی مجھے نہیں ہے۔۔!" شباہت نے کہا "میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک کہ تمہاری نہیں ہوتی۔ کتنی بڑی خود غرضی اور سنگدلی ہے کہ تمہارا تو مستقبل محفوظ نہ ہو اور میں سہرا باندھ کر گھوڑے پر جا بیٹھوں۔ لاحول ولا قوۃ —!"

"بکو مت —" عنبر نے کہا "میں انشاء اللہ توقیر کے لئے ایک نہایت اچھا تحفہ خریدوں گا۔"

"نہیں۔۔ اتنی۔ بیکار فضول خرچی نہ کرنا —"

"وہ میری بہن ہے۔ اس کا حق ہے مجھ پر — میں چاہے جو بھی اسے دوں۔ تم بھلا کون ہوتے ہو — میں تمہاری سنوں گا کہاں؟"

"تو یہ کہئے کہ توقیر سب کچھ ہوئی اور ہم کچھ نہ ہوئے۔ سلام کرتے ہیں ایسی دوستی کو — ہم جا رہے ہیں۔ اب نہ ملیں گے!"

"تم بہت کچھ ہو اور وہ سب کچھ!" عنبر نے کہا۔ شباہت اس سے لپٹ گیا: "میرے دوست۔ ساتھ چھوڑیں گے نہ ساتھ چھوڑنے دیں گے ... ہم بھی جائیں گے جدھر جائیے گا —"

دونوں ہنسنے لگے! پھر شباہت نے ہولے سے کہا: "کبھی تم بیرسٹر صاحب سے کبھی ملتے ہو؟ —"

"ہاں — اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مگر وہ مجھے پسند نہیں کرتے

میں ان سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کرتا! —

"معلوم نہیں .... کیا جواب دیتے ہیں .... یہاں سے تمہارا پیغام گیا تھا
دھڑکتے دل سے شباہت نے کہا — اور رخ پھیر کر لاپرواہ بننے لگا۔

جبیر نے ایک نامکمل سانس لے کر کہا: "جواب تو دو قسم کے ہوتے ہیں —
اثبات میں — نفی میں — تم یہ کیوں سوچے بیٹھے ہو کہ ان کا جواب تمہاری
خواہشوں کے مطابق بھی ہو سکتا ہے .... اپنا دل مضبوط رکھو کہ وہ منفی
جواب کے سہار سکے —"

"منفی جواب .... !" شباہت نے بات کاٹ کر سرد سانس لی — "
تم کہتے ہو کہ سہارنے کی طاقت پیدا کرو — میں کہتا ہوں کہ اس قسم
کے خیال سے دل دھڑکنے لگتا ہے!"

"پھر کیا چارۂ کار رہ گیا ہے — شباہت؟ —"
"تمہارا کیا حال ہوگا؟ —"

"ہاں شاید — میں کچھ اور پاگل ہو جاؤں ....!" اس نے اپنے بال
مٹھیوں میں جکڑ لیے — کچھ دیر ٹہلا، دیکھتا رہا — پھر اٹھ کر برآمدے
میں جا کھڑا ہوا — شباہت بھی اس کے پیچھے پیچھے نکلا — جبیر نے شفقت سے
اس کے کندھے جکڑ لیے — اور سرگوشیوں میں بولا: "کچھ لمحے زندگی
میں ایسے آتے ہیں .... جنہیں آدمی کبھی فراموش نہیں کر سکتا — انسان
کیوں پاگل ہو جاتا ہے؟ — اسی لیے نا وہ ناقابل یقین ناقابل برداشت
اور ناقابل فراموش لمحات یا واقعات دیکھ لیتا ہے .... تم کو وہ
یاد ہے — جب — جب وہ چھپا سا ہو کر میرے پاس آ گیا تھا
[illegible] .... تم کون ہو؟ .... یہ کیسا!

میری یادوں پر منڈلانے لگا ہے۔ کوئی روشنی اس دھند کو ہٹا نہیں سکی۔

"عبیر؟" شباہت نے اسے مخاطب کیا مگر اس نے اس کے کندھے چھوڑ دیئے اور پھر مڑ کر دور دیکھنے لگا۔ اونچے بلند پہاڑوں کی طرف جو بڑی دور تھے۔ جن پر ایستادہ اونچے درخت چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ گہرا اور گاڑھا اندھیرا زمین پر اترنے لگا تھا۔

پھر وہ بھی کہیں بار کیسے بڑبڑاتا چلا گیا۔ گرد و پیش سے بے خبر جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ شباہت کی آوازیں اس کے کانوں میں پہونچیں۔ مگر وہ بے خبر ہی رہا۔ اسے جواب دینے کا خیال بھی نہ آیا۔

"عبیر؟ ..." اس نے جھنجوڑ دیا۔

"ہاں! ..." ایک گہری سانس لے کر وہ بیدار ہوا۔

"یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ کہیں شراب تو نہیں پی رکھی ہے؟" یہ کہہ کر باوجود [illegible] شباہت نے ایک قہقہہ لگایا۔ عبیر کے لبوں پر ناقابل فہم مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"کیا کہا تھا تم نے ..." یکبارگی اس نے [illegible] تم نے [illegible] پوچھا۔

"پھر کہو۔ ایک بار اور کہو۔"

"کیا کہوں بار بار ..." شباہت نے کہا اور اس کا [illegible]

"آؤ وہاں چل کے بیٹھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا [illegible] تم تو کہیں کھو گئے تھے ..."

نجانے اس کے لاشعور میں کون سا ہیجان بھی [illegible] پھر [illegible] ہوگیا۔ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ چھا گئی۔ اور آنکھوں میں [illegible]

چمک آگئی جیسے پاگلوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ جو بے سوچے سمجھے ہر کام کر گزرتا ہے۔ شباہت کا دل دھڑک اٹھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے کس طرح قابو میں کرے۔ وہ اسے گھورتا رہا۔ عنبر نے یک لخت اس کا گریبان جکڑ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بتاؤ۔ تم کون ہو۔ وہ رات کون سی تھی۔ جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کھڑے کھڑے سو گیا تھا۔ میں نے شراب پی تھی... جو ابھی تمھاری زبان سے نکل گیا ہے... وہ لوگ کون تھے۔ چلتے پھرتے پُراسرار سائے جو اب بھی چل رہے ہیں۔ بے آواز ہنس رہے ہیں... سنو۔ سنو۔ دور پار رات کا شور گونج رہا ہے..." اس کا ہاتھ شباہت کے گلے سے ہٹ گیا۔ پھر وہ خواب میں بولنے لگا: "کیا مُدھر شور ہے... یہ انجم کہاں سے آرہا ہے... کہاں جائے گا۔ اب تو یہ میرے سامنے ہے ... مگر میں کسی کو نہیں پہچانتا...... کسی کو نہیں پہچانتا۔ یہ کیا تہلکہ دماغ میں ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے مجھے..." اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑے اور برآمدے کے ستون پر سر دے مارا۔ "یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ شباہت کچھ کر نہ سکا۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا!۔ مگر اس نے اس کے ہاتھ جکڑ لیے۔ اور گرج کر بولا "ہوش میں آؤ عنبر تم کیا بکنے لگے ہو۔ نہ تمہیں اپنی خبر ہے نہ میری" پھر اس نے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ کتنی بار کی آوازوں کے بعد عنبر بیدار ہو کے خواب سے جاگا اور شباہت کو دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم نے سنا۔ میں جا رہا ہوں" شباہت نے بلند آواز میں کہا "اور پھر کبھی تمہارے پاس آؤں گا بھی نہیں... میں باز آیا تمھاری دوستی سے"

خدا حافظ!"

جمشید وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ اور بانہیں پھیلا کر کہا " نہیں۔ نہیں بھائی ... یوں خفا نہ ہو واپس آؤ ـــ میں ـــ میں تم سے معافی مانگتا ہوں ـــ !" پھر اس نے بازو اپنی آنکھوں پر آڑے کر لیا اور رونے لگا۔ شاہت دم بخود اس کے پاس کھڑا رہا۔ نہ اسے منایا نہ سمجھایا۔

پرنس کلب اپنے سالانہ فنکشن بڑی دھوم دھام سے مناتا تھا۔ دور دور سے اولڈ ممبرز آتے۔ ڈیکوریشن پر ہزاروں روپے صرف کیے جاتے۔ بہترین اور مہنگے پروگرام باہر سے خریدے جاتے۔ نت نئے آئٹم پیش کیے جاتے! ـ سال کے آخری دن تھے۔ دسمبر کی سرد و تاریک طویل راتیں۔ اور اندھیرے میں مدغم راستے۔ رات جیسے شام ہی سے گہری تاریک ہونے لگتا۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پر کاروں کے قافلے آگے پیچھے رواں دواں تھے۔ ان کی ہیڈ لائٹس عجیب پر اسرار جادو بو رہی تھیں۔ کلب کے اندر میلا سا لگا تھا۔ ابھی پروگرام نہیں شروع ہوئے تھے۔ مگر رات کا حسن و شباب سر شام ہی سے نکھر سنور گیا تھا۔ جیسے زندگی کی روح رواں تھا۔ اسٹیج کے عین وسط پر نہایت شاندار میوزیکل کنسرٹ ترتیب دیا گیا تھا! ـ باہر سے موسیقار اور فنکار آئے تھے۔ اور ایک عظیم الشان آرکسٹرا بڑے ہال میں بیٹھا تھا! ـ فنکار آپس میں ہنس بول رہے تھے۔

مگر ان میں عنبر نہیں تھا۔ جس کا شدت سے سب کو انتظار تھا!

شباہت اور توقیر بھی کلب میں مدعو تھے۔ ایک کارڈ توقیر کی وساطت سے مدحت کو بھی ملا تھا۔ اور اس وقت توقیر اس کی خوشامد میں لگی تھی!

شباہت بیرسٹر صاحب کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ نہیں آئے! ان کا انتظار کر کے شباہت عنبر کی کوٹھی پر چلا گیا۔

توقیر کا خیال تھا کہ کم از کم یونہی مدحت باہر کی ہوا کھائے گی — چہار دیواری کی بے کیفی اور مایوس زندگی نے اس کا سارا حسن و جمال خاک کر دیا تھا! وہ تو سنگ مرمر کی بے جان مورتی لگ رہی تھی۔ نہ امنگ نہ ولولہ — توقیر باتیں کرتی رہی اور وہ خشک جلتی جلتی آنکھوں سے اسے تکا کی —

"بھائی صاحب کو پتہ کیا چلے گا؟ ..." توقیر کہہ رہی تھی! "ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے کمرے میں ابھی تک نہ آئیں۔ خواہ مخواہ گھٹی رہتی ہو۔ چلی چلو مدحو — ایسی بھی کیا وحشت تمہارے مزاج میں سمائی ہے"

"نہیں — توقیر —!" اس نے ہلکی سی سانس لے کر کہا اور سر جھکا لیا۔

اتنے میں ملازمہ نے ایک بند لفافہ مدحت کو تھما دیا۔

"کس نے دیا ہے۔ کس کا ہے؟" مدحت کا دل دھڑکنے لگا!

"جی کرنل صاحب کے آدمی نے —!" ملازمہ نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد مدحت نے کانپتی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا۔ اور بھیگی بھیگی نظریں خط پر دوڑائیں۔

"مدحت کوشش کرنا کہ آسکو۔

تم اگر نہ آئیں تو میرا ہر نغمہ ایک نوحہ بن جائے گا!"

مدحت نے کاغذ توقیر کی طرف بڑھا دیا اور خود دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ توقیر کے دل پر تو برچھیاں چلنے لگیں۔ کیسے دو مجبور دل آپس میں ایک ہو سکیں۔ وہاں وہ بے قرار ہے یہاں مدحت شمع کی طرح پگھل رہی ہے۔

میں کیا کروں..... میرے اللہ.....؛ توقیر بھی گریہ کناں تھی۔

جب کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ تو پھر بغاوت ــ!" توقیر نے کہا۔

"میں اگر کچھ نہیں کر سکتی۔ تو مر تو سکتی ہوں۔ توقیر!ــ" مدحت نے کہا۔

تم اگر مر جاؤ گی تو ابن بھیا بھی مر جائیں گے۔!" توقیر نے سسک کر کہا۔

یہی ذریعہ تو ملنے کا ہے توقیر ــ!" مدحت ایک نشیلی سی ہنسی ہنس پڑی:" تم بڑی ظالم ہو۔ روکتی ہو مرنے سے۔ ملنے سے ــ تم نے دوری کی مجبوری صرف دیکھی ہے۔ محسوس نہیں کی.....!"

"جو دیکھی ہے وہ محسوس کرنے سے بھی زیادہ ہے۔ میں شرمندہ ہوں مدحت۔ میں تمہاری دوستی کا دم بھرتی ہوں مگر تمہارے لئے کچھ کر نہیں سکتی!ــ"

"کیا کرو گی تم۔ نہ تمہارے بس میں میری تقدیر ہے نہ اُن کی قسمت ــ؟ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ توقیر۔ تم اپنی دلچسپیاں میری وجہ سے غارت نہ کرو!ــ"

"خدا غارت کرے دلچسپیوں کو ــ" توقیر نے کچکچا کر کہا:" بس تو میری ہوں دلچسپیاں دیکھنے کو.... تم نہیں جاؤ گی تو میں کبھی نہیں جاؤں گی!ــ"

نہیں نہیں۔ ایسے جلسے بار بار دیکھنے کو نہیں ملتے۔ تم ضرور جاؤ گی!" مدحت نے کہا۔ پھر وہ بن کر مسکرائی:" سنو۔ تم نہیں جاؤ گی تو شبو بھیا کا دل ٹوٹ جائے گا!ــ"

"میری بلا سے۔ ٹوٹے ــ!" توقیر نے جھنجھلا کر چہرہ پھیر لیا۔

مدحت؟.... "ذخشندہ باہر سے رخسانہ نے آواز دی۔ دونوں سنبھل گئیں۔

آئیے بھابی! — وہ جھپٹ کر دروازے کے پاس پہونچی۔

"کسی ڈاکٹر کو فون کریں۔ منو۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔"

انھوں نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔ "پکر گرتے بن نہیں پڑتا۔ بچے کو رات سے ہی ہلکا بخار ہے اس وقت کچھ زیادہ تیز ہو گیا ہے!"

"بھائی جان ابھی تک نہیں آئے؟" — مدحت نے ڈوبتے دل سے پوچھا اور توقیر کی طرف دیکھنے لگی۔ ان نگاہوں کا مطلب توقیر سے پوشیدہ نہ رہا۔ بھلا اس صورت میں وہ کہاں جاتی؟

"بھائی جان آ کے کون سا تیر مار لیں گے؟" — بھابی نے طنزیہ کہا۔ "تم جوشی صاحب کو بلا بھیجو۔"

"اچھا بھابی!" — مدحت نے لمبی سانس بھر کر کہا اور توقیر سے بولی: "اچھا بہن خدا حافظ۔" یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ مڑ کر نہیں دیکھا کہ توقیر بے کہ چلی گئی۔

رخسانہ کو علم تھا کہ موسیقی سے مدحت کو کتنا شغف تھا اور وہ گتنے شوق سے اکثر اسے سننے جاتی تھی انھوں نے توقیر سے کہا۔ "تم اسے لے جاؤ۔ بےچاری اسی بہانے گھر سے نکلے۔ میں آپ سے جوابدہی کر لوں گی۔"

"مگر بچے کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے!" توقیر مایوس ہو کر بولی۔

"اس کے لئے منو کیا کر سکے گی۔ توقیر میں اسکے لئے دکھی رہتی ہوں مگر کچھ کر نہیں سکتی۔ وہ تو پتھر ہیں۔ انھیں ہزار سمجھایا کہ عبیر کی یادداشت ہی تو باقی رہ گئی ہے اور ان میں کوئی خامی نہیں ہے مگر انھوں نے مجھے جھڑک دیا۔"

منو کی قسمت بھابی —؟

پھر توقیر نے ایک مرتبہ مدحت سے چلنے پر اصرار کیا۔ مگر وہ بھائی کے خوف سے نہیں گئی۔ جب توقیر چلی گئی تو اس نے گریبان سے عبیر کا ننھا سا خط نکالا

جھلملاتی آنکھوں سے اسے پڑھا اور بے آواز رو پڑی۔

عبیر کو بھی اس کا بے چینی سے انتظار تھا! اُسے توقع تھی کوئی تو آ کے خبر سنائے گا کہ مدحت توقیر اور رخشاں بہت کلب چلے گئے ہیں مگر اس کے پاس کوئی نہیں آیا۔

اس نے بے دلی سے لباس بدلا اور وقت کے گزرنے کی پرواہ کئے بغیر برآمدے میں کھڑے ہو کر سگریٹ پھونکنے لگا۔

"تمہارا فون ہے۔ ابھی۔۔۔!" وہاں سریہ آ گئی۔

"اچھا!" اس نے کہا اور پھر سگریٹ سے سگریٹ سلگا لیا۔

"سنو۔ گھنٹی بج رہی ہے!" سریہ نے زور دے کر کہا۔

"ریسیور میز پر ڈال دو۔ اور تم یہاں سے چلی جاؤ!"

"سنو گے نہیں!۔ کون ہے فون پر!"

اس نے برہم نظر سریہ پر ڈالی اور چہرہ پھیر کر کہا: "نہیں!"

"تم پھر سگریٹ پی رہے ہو!"

"ہاں!"

"اچھا تو کلب چلو۔ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے!"

"سریہ!"

"کیا ہے!"

"تم میرا پیچھا چھوڑنے کا کیا لو گی؟"

سریہ بھنا کر فون سننے چلی گئی۔ عبیر لاتعلق سا وہیں کھڑا رہا۔ پھر دو منٹ بعد وہ واپس آئی اور اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے بولی۔

"ابن۔ سنتے ہو۔ توقیر کا فون تھا۔ تمہارے نام۔ کہہ رہی تھی کہ وہ کلب

نہیں جائے گی کیونکہ مدحت نہیں جا رہی ہے۔ دانش صاحب کے بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مدحت کا گھر پر رہنا ضروری ہے!"

"کیا؟" اس نے سگریٹ دور اچھال دیا اور سر پکڑ کر گھورنے لگا!

وہ چپ رہی عبیر و مدحت کے جذباتی رشتے کو وہ خوب جانتی تھی۔ اس کا دل دُکھ رہا تھا!

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ عبیر نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"جی ہاں۔ منیجر صاحب۔۔۔ میں عبیر ہی بول رہا ہوں۔" اس نے اُدھر سے بولنے والے کو پچھاڑ کھایا۔" معاف کیجئے۔ میں کلب نہیں آسکتا۔ آپ اپنا پروگرام شروع کرا دیجئے۔

جی نہیں۔۔۔ میرے پرابیٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ سب سیکھ چکے ہیں۔ ہاں ہاں۔ میں معاوضہ واپس کر دوں گا۔۔۔ شکریہ!"

اور ریسیور کریڈل پہ پٹخ کر باہر چلا گیا۔ سریہ اس کا الشٹر لئے ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔۔۔

جب وہ دانش صاحب کی کوٹھی پر پہونچا ہے تب خاصی رات ہو گئی تھی زینے کے آخری سرے پر اسے تو قیر مل گئی اور حیرت و تعجب کی ایک چیخ مار کر اس نے کہا۔" عبیر بھائی۔۔۔ آپ یہاں"

"اچھا ہوا۔ تم مل گئیں [illegible]۔۔۔" اس نے آگے بڑھ کر توقیر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا [illegible] پھر پیچھے سے کہا۔" میں بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اندر لے چلو"

سامنے ہی سب لوگ تھے [illegible] عبیر کو دیکھ کر ان پہ بجلی سی گر پڑی۔ کیسے پتہ تھا کہ وہ یوں چلا آئے گا۔ [illegible] بچہ اپنے بستر پہ پڑا تھا اس کے اطراف سب بیٹھے

"اسے کیا ہوا؟" — عبیر نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" رخسانہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: "ابھی کچھ دیر پہلے جوشی صاحب انجکشن دے کے گئے ہیں! —"

عبیر نے چاہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر بچے کا بخار دیکھے۔ لیکن رخسانہ سہم گئیں ابھی چند روز پہلے سن چکی تھیں کہ اس نے شاہرت کا گریبان جکڑ لیا تھا۔ انھو نے جلدی سے عبیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بچے کا بخار دیکھنا چاہتا ہوں۔ رخسانہ بہن!" اس نے حیران آنکھیں اٹھائیں۔ مگر رخسانہ نہ مانیں۔ عبیر نے چپ چاپ اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ تو قیر کو بڑا صدمہ ہوا۔ مدحت بھی الگ تھلگ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ایک تیز و تند طغیانی اس کے ارد گرد تھی اور وہ اس میں تنکے کی طرح بہی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر کان کچھ سننے سے بے بہرہ تھے۔ — احساس بھی فنا ہو چکے تھے۔ اس نے ایک نظر عبیر کے بھاری بھرکم پیکر پر ڈالی اور کسی نشے سے مدہوش ہو کر اندھی بہری بن کر رہ گئی تھی! —

عبیر بچے کے پائنتی ٹک گیا۔ اور توقیر مدحت کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔

"بھابی کا سلوک تم نے دیکھا —" توقیر سسک کر بولی۔

"کس کا خیال۔ انھیں یہاں تک لایا۔ توقیر —!" مدحت خواب کے سے لہجے میں بولی: "کس کا خیال — وہ کلب نہیں گئے — ان کی موجودگی تو سب سے زیادہ ضروری تھی۔"

اچانک دالان سے رخسانہ کی ہلکی سی چیخ اور ان کے رونے کا شور سن کر دونوں کو ہوش آیا۔ جلدی سے کمرے سے بھاگیں۔ انھیں دکھائی دیا کہ دانش صاحب رخسانہ کو الگ ہٹا رہے تھے بستر پہ بیمار بچہ ہاتھ تان رہا تھا

اور اس کے حلق سے خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی! ـــ

یا خدا ـ خیر ـــ !" توقیر کی نگاہوں میں اندھیرا چھانے لگا! ـ

دانش بے حد پریشان اور مضطرب تھے :" کون سا انجکشن دلوا دیا ـ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یہاں فون کہاں ہے ـ توقیر ـــ فون کہاں ہے؟ ـــ" عبیر نے آہستے ہلایا، پھر وہ خود ہی ایک اسٹینڈ پر فون رکھا دیکھ کر ادھر جھپٹا ـ جلدی جلدی ... کسی کو فون کیا اور پلیٹ کر دیکھا ـ بچے کی حالت اچھی نہیں تھی ـ وہ ان کے پاس آیا اور اپنی محبت پاش آواز میں انھیں سمجھانے لگا :" رخسانہ بہن ... اللہ سے مدد مانگئے ـ ڈیڈی آئے ہوں گے ـ وہ ضرور کوئی تدبیر کریں گے ـــ!" اس کی نگاہیں مدحت پر بھی پڑیں ـ جو سکتہ زدہ سی بچے کو دیکھ رہی تھی ـ پتھرائی ہوئی آنکھوں ـــ

دس منٹ گزرے ہوں گے ـ ملازم کرنل اختر صاحب کو لے کر آگیا ـ اس وقت کسے ہوش تھا کہ دوستی دشمنی کا خیال کرتا ـ وہ آنے کے ساتھ ہی بچے پر جھک پڑے ـ رخسانہ سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور دانش سوچ رہے تھے کہ معاملہ ہاتھ سے گیا ـ ان کے دل میں چور تھا وہ عبیر کے سلسلے میں انھیں سخت جواب دے چکے تھے ـ اور ڈر رہے تھے کہ اس کا بدلہ کرنل صاحب ان کے بچے سے ضرور لیں گے ـ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا انجکشن دے دیں جو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے ... وہ بیچارہ ناگواری سے عبیر کو دیکھنے لگے! ـــ البتہ رخسانہ کا خوف دور تک نہیں، وہ انھیں بچے کی ہسٹری دینے لگیں! ـــ

"کرنل صاحب ـ میرا بچہ اچھا ہو جائے گا نا؟ ـــ" وہ رونے لگیں ـ

"ہاں بیٹی ـ ضرور اچھا ہو جائے گا! ـــ" انھوں نے بڑی میٹھی آواز میں تسکین

دی: "اس کا سینہ جکڑا ہوا تھا۔ یہ آواز اسی کی ہے۔ ایسے دورے بچوں پر اکثر پڑتے ہیں۔ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے... میں ایک انجکشن دیئے دیتا ہوں — رات بھر میں افاقہ ہو جائے گا۔ صبح کو میں پھر دیکھنے آؤں گا!"

وہ اس کے انجکشن کا سامان کرنے لگے۔ عبیر مطمئن و مسرور ان کے پیچھے کھڑا تھا پھر اس کی نظریں سرہانے اٹھیں۔ وہاں مدحت نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے دفعتہً بجلی فیوز ہو جائے! — چپکے سے فوراً باہر نکلا چلا گیا! —

پھر دلاسہ و تسلی دے کر کرنل صاحب بھی رخصت ہوئے! — لو تیز کی گئی۔ بچہ بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ رخسانہ مطمئن انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ دانش صاحب کرسی پر بیٹھے یوں پاؤں ہلا رہے تھے جیسے ان کا طیش و غضب پھٹ پڑنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہا ہو — ندامت کی مار — ملازمہ نے کہا: "بی بی جی کھانا تیار ہے!"

"چلئے کچھ کھا لیجئے۔ اب تو اللہ کا فضل ہے!" رخسانہ نے کہا مگر دانش صاحب پھٹ پڑے: "پھینک دو کھانا اٹھا کے۔ زہر کھانا بہتر ہے ذلت کے کھانے سے۔ میں پوچھتا ہوں۔ یہ لوگ جو ابھی ابھی دفع ہوئے ہیں۔ کیوں آئے تھے کس نے بلایا تھا؟"

"خدا کے لئے آہستہ بولئے۔ منا جاگ اٹھے گا!" رخسانہ نے سہم کر کہا

"میں کیا پوچھ رہا ہوں!" اب کی وہ چنگھاڑے۔

"بات کا بتنگڑ نہ بنائیے!" رخسانہ نے ناگوار لہجہ میں جواب دیا: "انہیں کسی نے نہیں بلایا۔ عبیر خود آئے تھے۔ بچے کی حالت دیکھ کر انہیں نے ہی ڈاکٹر صاحب کو بلایا تھا۔"

"تم ایک بیرسٹر کو قانون پڑھانے کی کوشش کر رہی ہو!"

"بس کیجئے۔ آپ صبح سے شام تک جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ سنتے ہیں۔ کسی کی سچی بات کا مشکل سے آپ کو یقین آتا ہے۔ جھوٹے حلف اٹھواتے ہیں آپ۔ آپ کے سامنے حلف اٹھانا بھی بیکار ہے... جو کچھ آپ کا دل چاہے۔ سمجھ لیجئے" رخسانہ نے جواب دے ہی دیا۔ اور بیمار بچے کو ہاتھوں پر اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

توقیر جب اپنے بنگلہ پر پہونچی تو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ عبیر اس کے یہاں تھا۔ اس کی امی کے پہلو میں بیٹھا نجانے کیا سوچ رہا تھا وہ بھی خاموش تھیں۔ توقیر جھپٹ کر پاس آئی۔ اور خوشی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی "ابن بھیا! آج کدھر آپ راستہ بھول گئے ___؟"

اس نے ایک بڑی گہری سانس لے کر کہا "توقیر.... تم نے دیکھا میں جس چیز کا مستحق ہوں مجھے وہی ملتی ہے۔ طعن، صدمہ، پچھتاوا۔ مجھے رخسانہ بہن نے بچے کو چھونے بھی نہیں دیا۔ وہ مجھ سے ڈرتی ہیں۔ میں سہہ نہ سکا۔ توقیر!"

"کیا آپ رو رہے ہیں، عبیر بھائی!" توقیر ہک سے رہ گئی۔

ہاں... اس کے آنسو بہنے لگے! "لوگ مجھے پہچانتے کیوں نہیں... کیا کرتا ہوں میں کسی کے ساتھ... کیا کرتا ہوں میں... کیا کرتا ہوں!"

میاں۔ مرد کے سینے میں پتھر کا دل ہونا چاہئے! " توقیر کی امی نے کہا اور اپنے سفید آنچل سے اس کے آنسو پونچھ دیئے "یہاں کا یہی قاعدہ ہے بیٹا لوگ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ تم کب تک ایک ایک کے سلوک پر روؤ گے!"

عبیر بھیا۔ میں نہیں بیان کر سکتی کہ آپ کے آنے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے"
توقیر نے اسے بہلا لیا۔ بچوں کی طرح ۔۔۔ "میری خوشیوں کا ملیا میٹ نہ کیجیے۔ آپ نے کھانا کبھی نہ کھایا ہوگا؟"

"نہیں توقیر۔ سنو تو سہی۔ میں گھر جا کر ۔۔۔!" عبیر نے کچھ کہنا چاہا۔
"یہ بھی تمھارا اپنا گھر ہے بیٹا! " امی نے بڑی محبت سے کہا: "توقیر کو تم نے بہن بنایا ہے وہ تو تمھارے گن گاتی ہے۔" اتنے میں بوا لطیفن انگیٹھی میں کوئلے دہکا لائیں۔ توقیر کھانے کے انتظام میں بھاگی۔ سردیاں تیز تھیں۔ وہ کوئی گرم لباس بھی نہیں پہنے تھا۔ امی کو محسوس ہوا کہ وہ سردی کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ انھوں نے اٹھ کر بڑا دروازہ بند کر دیا اور اپنا خوشبودار کا اس پر اڑھا دیا۔ عبیر ان کی محبت اور حسن سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا۔

توقیر ڈھک کر طشتریوں میں کھانا لے آئی۔ اس کی امی نے اپنے پلنگ پر دسترخوان بچھا دیا توقیر نے کرسی آگے کھسکا دی۔

"آئیے۔ آپ تو سونے کی تیاری کر رہے ہیں!" وہ ہنس پڑی۔
"ہاں بیٹا آؤ۔" امی نے بڑے پیار سے ہنس کر کہا: "بالکل تکلف نہ کرو۔"
اور کھانے پینے کی چیزیں اس کے آگے رکھنے لگیں!۔۔۔ پلاؤ کی قاب سے گرم گرم خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ایک پلیٹ میں کباب تھے۔ طشتری میں چاندی کا ورق لگا گاجر کا حلوہ تھا!۔۔۔

"کھانا دیکھ کر بھوک لگنے لگی!" وہ توقیر کو دیکھ کر ہنسنے لگا!۔۔۔ جب تک اس نے کھانا ختم نہیں کیا۔ سب اس سے باتیں کرتے رہے ۔۔۔ بے معنی۔ بے تکی تاکہ وہ ذہن سے پچھلی تلخیوں کا اثر مٹا سکے!۔ جب اس نے ہاتھ کھینچا تو لطیفن بوا حیرت سے بول لیں۔

"بس ؟ ۔ بھیا ابھی کچھ تو تم نے چھوڑ دیا ہے؟"

"عبیر میاں ۔ گاجر کا حلوہ تو تم بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ یہ طشتری تو ختم کرتے!" امی نے کہا ۔

عبیر بھائی ۔ ایسا بھی کیا تکلف ہے ؟" توقیر ٹھنکی ۔

اس نے آدھی چھوڑی ہوئی طشتری اٹھائی اور جلدی جلدی صاف کر دی ۔

"بس خالہ امی" ۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا " اگر اور کچھ کھاؤں گا تو یہاں سے سیدھا سپتال پہونچوں گا!" توقیر ہنس پڑی ۔ اور اس کا ہاتھ دھلانے کے لئے گرم پانی لے آئی ۔ پھر جھک کر اس نے کہا " کلب میں آپ کی غیر حاضری میں کیا ہوا ہو گا ؟"

نقصان ؟ " وہ دفعتہً ہنس پڑا " ان کا نہیں میرا ۔ تقریباً پچیس ہزار روپے واپس کرنے پڑیں گے ۔ ۔ ۔ جن میں سے لگ بھگ دس ہزار میں خرچ کر چکا ہوں! ۔ خیر آؤ امی کے پاس بیٹھیں ۔ آہا ۔ توقیر ۔ امی کی باتوں سے ۔ ان کی ہر جنبش سے کیسی اچھی خوشبو آتی ہے ۔ جیسے مسجد کے محراب سے آتی ہے ۔ جیسے منبر سے اس وقت اڑتی ہے ۔ جب موذن اذان دیتا ہے ۔ جب ۔ جب میں کعبہ اور مدینہ کی تصویریں دیکھتا ہوں تو کوئی مقدس اور غیر محسوس سی خوشبو میرے آس پاس میرے دل کی گہرائیوں میں پھیلنے لگتی ہے ۔ ۔ ۔ توقیر ۔ تم کتنی خوش قسمت ہو ۔ تمہیں امی کا قرب حاصل ہے !"

توقیر حیرت سے اس کی شکل تکتی رہ گئی ۔

دونوں پھر ان کے پاس آ بیٹھے ۔ لطیفن بوا نے کافی کا پانی انگیٹھی پر رکھ دیا ۔ ان میں مختلف باتیں ہوا کیں ۔ توقیر کی امی ایک بہت اچھی نیک خاتون تھیں جسم انسانوں کا اور دل فرشتوں کا سا رکھتی تھیں ۔ یہی وجہ تھی کہ آدمی ان کے

پاس بیٹھ کر اپنے سارے دکھ بھول جاتا تھا عبیر بھی چند لمحوں کے لیے سب کچھ
فراموش کر گیا لطیفن بوا نے کافی بنائی جو اس ماحول و موسم میں سونے پر
سہاگہ بن گئی۔ توقیر نے ہنسی جوکس چھیڑ دیئے۔ عبیر سچے دل سے ہنس رہا تھا۔
بالکل ایک چھوٹے سے بچے کی طرح۔ جس کی ننھی سی زندگی کا اس عمر میں
کوئی واضح مقصد نہیں ہوتا۔ پھر جب دیر ہو گئی اور عبیر نے جانے کی اجازت
مانگی تو امی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے سمجھایا۔

"بیٹا۔ کبھی کسی کے کہنے سننے کا اثر نہیں لینا چاہیئے۔ ہر ایک کے سوچنے
اور بولنے کے طریقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ آج تمھارے رونے سے مجھے
بہت تکلیف پہنچی بیٹا۔!"

"مگر خالہ امی۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟" عبیر نے کہا: "لوگ مجھ سے خواہ مخواہ
خفا رہتے ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ زمانے نے مجھے کتنا ستایا ہے۔ حالانکہ میں
نے زمانے کو نہیں ستایا۔ دنیا والوں سے دور، گمنامی، کم آمیزی اور گوشہ نشینی
کی خاموش زندگی بسر کرتا ہوں۔ لوگ مجھے ستاتے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔
مجھ پر ہنستے ہیں.... آپ سا دل کسی کا نہیں۔ کاش میں عمر بھر بیٹھا آپ کی باتیں
سنتا رہتا۔!"

وہ مسکرائیں: "اللہ تمہیں نصیبہ ور کرے میرے بیٹے۔ میری یہی دعا ہے۔"

"امی آپ دیار کعبہ جا رہی ہیں...." دفعتہً عبیر کی آواز بھرا گئی: "ذرا کعبہ
پر میرے لئے دعا مانگئے گا.... میری بدنصیبی مجھ سے دور ہو جائے...."

"ایسا ہی ہوگا میرے بچے ایسا ہی ہوگا۔ خدا تمہیں عمر دراز عطا فرمائے
پھلو پھولو اپنی مرادوں کو پہنچو!"

لطیفن بوا اپنے پاندان سے پان لگائے اور ننھی سی تھالی میں رکھ دیا

رالائچیاں رکھ کر عبیر کو بھی پیش کیں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "جی نہیں... اماں
میں پان نہیں کھاتا!"

"کھا لیجئے" توقیر نے سفارش کی "اماں کا دل چھوٹا ہو جائے گا!"

عبیر نے ہنس کر دونوں گلوریاں اور الائچیاں اٹھا لیں اور پان کھاتے ہوئے ہنس کر کہا "اچھا تو اماں کا دل ربر کا ہے کبھی چھوٹا ہو جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے"

بوا بے حد محظوظ ہوئیں۔ پوپلے منہ سے ہنستے ہوئے دعائیں دینے لگیں۔

تقریباً دس بجے رات کو وہ ان سے رخصت ہوا۔ توقیر نے اپنے شوفر کو اس کے ساتھ کر دیا۔ گھر پہنچا تو پھر ماحول کی اداسی کہرے کی طرح ذات پر منڈھ کر رہ گئی۔ سطوت جہاں، ظہیر صاحب سب دالان ہی میں بیٹھے کرنل صاحب اور ثمینہ بیگم سے باتیں کر رہے تھے۔ سربرہ بھی تھی مگر اس نے عبیر کو دیکھ کر گال پھلا لئے۔

"خیریت۔ بجو کبھی ہے؟" وہ سطوت جہاں کے پہلو میں جا بیٹھا اور ان کے چھوٹے سے بچے کو ان کی گود سے لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"کہاں رہ گئے عبیر؟" ظہیر نے پوچھا "کئی فون کلب سے آ چکے ہیں!"

"کچھ جی نہیں لگا" عبیر نے کہا اور بچے کو گدگدیاں کر کے ہنسنے لگا! لیکن اس کے دل پر رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ آج اسے مالی نقصان پہنچا تھا۔ سرحت سے وہ مل نہ سکا بیرسٹر صاحب نے اس کے اینار کو پسند نہ کیا تھا۔ وہ اپنی واحد دلچسپی موسیقی سے بہت دور کر دیا گیا تھا۔ پھر وہ خیالوں خیالوں میں وہاں سے بہت دور پہنچ گیا اور دفعتہً بچہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گرنے لگا۔ سطوت جہاں چونکیں اور بچے کو سہارا دے کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ شرمسار سا ہنسنے لگا

سطوت جہاں نے پوچھا "کیا سوچنے لگے تھے۔ ابن؟"

"کچھ بھی نہیں بجو بھی" وہ مغموم انداز میں مسکرایا۔

چلنے والے پیتے ہیں ہنستے ہنستے زہرِ حیات:

اور چپکے سے بچہ انھیں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سطوت جہاں نے آہ بھر کر کہا: "بھائی جان کیا حال ہوگا ان کا جب پتہ چلے گا کہ دانش صاحب نے سخت جواب دے دیا ہے۔ ابھی تو وہ اچھی صورت حال کے منتظر ہیں؟ ——"

"میں تو کوئی اور بات بھی سوچتا ہوں سطوت! —" کرنل صاحب نے پُرخیال انداز میں جواب دیا: "ہو سکتا ہے کہ ان کی شادی ہو جائے۔ مگر... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ..... انسان کی جبلّت اور فطرت اور آدمی کے فطری تقاضوں سے بھی بے بہرہ ہو چکے۔ کیوں ہم سب ایک ناکردہ گناہ لڑکی کا جبر و عذاب سمیٹیں: مجھے بے حد صدمہ ہے! ——"

"کیا یادداشت کا نہ ہونا ایسا بُرا مرض بھی ہو سکتا ہے! ——" ظہیر نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بھائی ——" وہ آہ بھر کر بولے: "کیا یہ مرض نہیں ہے کہ ایک ہوشمند تعلیم یافتہ اور تندرست انسان سب کچھ بھول جائے! — میں نے اکثر دیکھا کہ وہ اپنے دستخط بھی بھول گئے۔ امتحاناً بعض چیکوں پر دستخط لیے تھے! ——"

"خدا ہی میرے بچے کے حال پر رحم کرے ——" ثمینہ بیگم نے کہا۔ اور اور ضعف جانی کے عالم میں وہیں اوندھی لیٹ کر پڑ رہیں۔ ——

سرمد حواس سے خفا تھی۔ اٹھ کر ظہیر کے کمرے میں پہونچی! — اس نے ابھی تک لباس نہیں بدلا تھا! — مسہری کے پائینتی بیٹھا سگریٹ کے طویل کش لگا رہا تھا! — سرمد کو دیکھ کر سگریٹ خاکدان میں ڈال دیا — اور استفساراً انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا! ——

"میں تم سے بہت خفا ہوں! ـــــ" وہ گال پھلا کر بولی۔
"بڑی مصیبت ہے" عبیر مسکرایا "چھوٹی چاجان بھی موجود نہیں کہ ان سے تمہاری شکایت کر سکوں۔"

"میں تم سے بولوں گی بھی نہیں۔"

"بول تو رہی ہو! ـــ"

"تم نے مجھے جھڑکا تھا! ـــ اب تم مجھ پر بھی آنکھیں نکالنے لگے ہو۔ میں جا رہی ہوں۔ کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی! ـــ" یہ کہہ کر وہ مڑی ہی تھی کہ جھپٹ کر عبیر نے اس کی بانہہ جکڑ لی۔

"بس اتنی ہی تمہاری محبت ہے کہ ایک دفعہ کی میری خفگی بھی نہ سہہ سکو۔" اس نے الٹی شکایت کی "تم تو مجھے روز ڈانتی ہو۔ خفا ہوتی ہو۔ میں تو تمہارا ہر کہا مانتا ہوں اور کبھی نہیں کہتا کہ میں تم سے نہیں بولوں گا! ـــ"

"اُن ..... !" سریر اس کے سینے پر سر رکھ کر ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ آؤ ـــ سچ میں تمہیں اچھے اچھے گیت سناؤں ..... !"
وہ بھی ہنسنے لگا اور سریر کو ساتھ لئے پیانو کے اسٹول پر جا بیٹھا۔

سریر غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے سے اس چہرہ کی پریشانی رہی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں ایسا اثر تھا کہ دیکھنے والا سوچتا رہ جاتا۔ ایک تیس بتیس سال کے مرد کی ایسی آنکھیں جیسے پانچ چھ سال کے معصوم بچے کی ہوتی ہیں جو دنیا کی کوئی بات نہیں جانتا! ـــ پھر عبیر نے دھن چھیڑ دی۔

کوئی امید نہ ہو ہم ... انسان کا ساتھ چھوڑ جائے تو پھر زندگی کیسی ہے۔ نہ کوئی

نصب العین نہ لائحۂ عمل نہ جادۂ حیات نہ تعین منزل ــــ وہ تو حالات و واقعات کے بحرِ بیکراں کا بھنور تھا بھنور ــــ ہولناک و مرگ آفریں۔ جس میں ایک بے حقیقت تنکے کی طرح رحمت کی زندگی چکرا رہی تھی ۔

اُمید کا دامن اس نے ہاتھ سے چھوڑ دیا ــــ اور قسمت کے حوالے اپنی حیات بے ثبات کر دی، ہونا ہے گا کچھ نہ کچھ ۔ گھبرائیں کیا ۔؟!

پہلے پہل رحم و مروت کی ہلکی سی آس اُس کے دل میں تھی مگر اب سب کچھ جہاں تہاں ہو گیا تھا ۔ بیرسٹر صاحب سنگ خارا بن گئے تھے ۔ یہ نہیں سوچتے تھے جب چہیتی بہن کی زندگی بچانے کے لیے وہ اتنے سنگدل بن گئے ہیں ۔ درحقیقت وہ زندگی لینا چاہتے ہیں ۔ آہستہ آہستہ اُسے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں !ــــ

رخسانہ البتہ اس کی تنہا غمخوار تھیں مگر زبانی ہمدردی رحمت کو کیا دیتی اور ان کی ہمدردی بھی بیکار تھی ۔ وہ شوہر کے حکم و مرضی کے آگے بے بس تھیں !۔ [illegible] اپنی راہ خود ہی بند کر دی تھی ۔ اُسے یہ خیال بھی نہ آیا [illegible] عیادت کر کے دانش صاحب کے دل میں اپنی جگہ بنائے وہ ان ذہنی احساسات سے بالاتر تھا ۔ ہلکی ہلکی باتیں نہیں سوچتا تھا مگر دانش تو یہی سمجھے کہ وہ نہ صرف خود آیا تھا بلکہ اپنے باپ کو بھی لایا تھا تاکہ اپنے سلوک سے انھیں متاثر کرے ۔ انھوں نے بیوی سے کہا تھا ۔

"یہ سب مکاری چالبازی ہے ۔ تم آدمی کے ظاہری فعل سے مرعوب ہو جاتی ہو ۔ میں عدالت میں ہر روز عیاریوں اور ریاکاریوں کا مظاہرہ کرتا رہتا ہوں ۔ اپنی غرض کے لئے اگر آدمی نے ہاتھ پاؤں ہلا دیئے یا زبان چلا دی تو کیا ۔ وہ لوگ کسی بڑے فائدے کی اُمید میں ہیں ۔

آپ نہ منصب دار نہ جاگیردار۔ کسی کو کیا دیں گے!۔" دانش کی بہن کبھی تھیں۔ ناخوشگوار لہجے میں بولیں: "بیکار آپ کو اختر صاحب اور ان کے گھرانے سے ضد پیدا ہو گئی ہے۔ ظہیر بھائی اکثر ہمارے یہاں آتے رہتے ہیں۔ ایسے اچھے آدمی ہیں کہ کبھی حرف مطلب زبان پر نہیں لائے۔!"

خیر وہ لوگ فرشتہ سہی۔ مگر میں کہہ چکا ہوں کہ اس خاندان میں منو نہیں جاسکتی!" دانش نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"یہ اور بات ہے کہ نہ جائے" نکہت نے جل کر کہا: "مگر خواہ مخواہ ان کی غیبت کر کے آپ کیوں گناہ مول لے رہے ہیں!۔"

پھر وہ اٹھ گئے تو دونوں عورتوں نے خوب جلے دل کے پھپھولے پھوڑے انھیں دانش کی زیادتی پر تاسف تھا اور غصہ بھی۔ عبیر کو دونوں ہی مدحت کے لیے پسند کرتی تھیں۔ ان کے نزدیک یادداشت کا فقدان کوئی قابل ذکر بات یا ناقابل علاج مرض نہیں تھا۔ وہ اتنی زیادہ مشرقی اور وفا شعار عورتیں تھیں جو شوہر کو ہر روپ میں دیوتا اور خدائے مجازی سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں اور عبیر تو ظاہری پوزیشن میں نہایت اچھا تھا۔۔ دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچیں۔

"میرا دل تو چاہتا ہے کہ اپنے یہاں بلا کر منو کا نکاح معاذ سے پڑھا دوں" نکہت نے کہا۔ "معلوم نہیں کس کمبخت کی ناراضگی سے اس کی قسمت پھوٹیں گے۔"

"ارے بہن ساری زندگی کو تمھارے دشمن بن جائیں گے۔" رخسانہ نے کہا۔

بن جائیں بلا سے" نکہت نے جواب دیا: "میری بہن کی زندگی بن جائے۔ اور مجھے کیا چاہیے!" پھر وہ رازداری سے بولیں۔

ساتھ لے جاؤ۔ شاید وہاں اس کا دل بہلے۔"

شام کو جب نکہت اپنے گھر جانے لگیں تو دانش صاحب آفس سے آ گئے تھے۔ انھوں نے بہن کو روکا بھی نہیں۔ اب بھی جھنجھلائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ نکہت نے ان سے مدحت کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے بے حد رکھائی سے پوچھا "کیوں؟"

"بس ایسے ہی جی چاہتا ہے میرا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔" نکہت نے غصہ ضبط کر کے کہا۔

"کب واپس بھیجو گی؟" دانش صاحب نے کہا۔

"جلدی آ جائے گی۔ جلدی کس بات کی ہے۔"

"میں نے سنا تھا کہ رفیع سے ملنے ظہیر صاحب وغیرہ آتے رہتے ہیں!"

نکہت کے کان جلنے لگے۔ طیش کے مارے بولیں "بلا سے آتے ہوں۔ ہر دو بیٹے کسی کو کیا کام؟"

"تم لوگ اس پاگل لونڈے پر فدا ہو۔ میں جانتا ہوں۔ اختر صاحب کی حذاقت کے گن گاتی ہو کبھی معاذ کی صداقت کے قصیدے پڑھتی ہو۔ کبھی ان لوگوں کے خلوص پر صدقے قربان جاتی ہو۔ مگر میں یہ آخری اور قطعی بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی کے ایثار، قربانی یا نفع نقصان یا بے پایاں خلوص و محبت پر میری اب یہ زبان میں بھینٹ نہیں چڑھے گی" اور یہ کہہ کر دانش صاحب اٹھ کر باہر چلے دیے۔

نکہت کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ رخسانہ پژمردہ آواز میں بولی "بہن! تم نے دیکھ لیا۔ کل سے اب تک ان کے دل سے یہ کینہ نہیں نکلا ہے کہ اختر صاحب میرے بچے کو دیکھنے کیوں آئے تھے؛ بتاؤ

بہن! اس کا کیا علاج ہے؟

"دیکھو بینا! مدحت کو قبر کے کنارے پہنچا کر دم لیں گے۔ اس کی جان کے گاہک بنے ہیں، اس کی خوشی دیکھ نہیں سکتے" نکہت چیخ کر بولیں۔ "اس کی آرزو کو خاک میں ملا رہے ہیں۔۔۔ میرے بس میں ہوتا تو میں وہ کام کر کے دکھا دیتی جو ناممکن بنا ہوا ہے۔"

وہ مدحت کو سینے سے چمٹا کر خوب روئیں۔ مگر مدحت کی آنکھوں سے ایک آنسو نہ نکلا۔ اپنی بے رحم تقدیر پر وہ قانع ہو چکی تھی۔ پھر نکہت گئیں اور اس کے لیے ملامتیں چھوڑ گئیں۔ دانش صاحب دالان میں آئے اور خوب چنگھاڑتے دہاڑتے رہے ــــ اتنے میں کمپاؤنڈ میں نئی آواز میں کار کا ہارن گونجا اور دوسرے لمحے کال بیل بجتی سنائی دی۔ پھر ملازم نے ڈرتے ڈرتے کرنل صاحب کی آمد آمد کی خبر دی۔

"خدا کے واسطے خاموش رہیے!" رخسانہ نے کہا۔ "آپ کی آواز باہر تک جائے گی۔"

"کیوں آتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" دانش نے جھلا کر ملازم سے پوچھا مگر آواز مدھم کر لی۔

"جائیے انھیں لے آئیے!" رخسانہ نے بڑی خوشامد سے کہا۔ "کب تک باہر کھڑے رہیں گے؟"

طوعاً و کرہاً دانش صاحب باہر گئے اور خون کے گھونٹ پیتے ہوئے انھیں سلام کیا۔

"جیتے رہیے میاں!" کرنل صاحب نے کہا۔ "کہیے! اب بچہ کیسا ہے؟"

اچھی بات بہرحال دانش کے منہ سے نکل ہی گئی۔ "الحمد للہ۔ اب تو بالکل

ٹھیک ہے۔ جناب کے ایک انجکشن نے مسیحائی کی۔ تشریف لائیے!"

دالان میں پہنچے تو رخسانہ نے جھک کر سلام کیا۔ کرنل صاحب نے کہا:

"بچے کو لاؤ بیٹی! میں اسے ایک مرتبہ اور دیکھ لوں۔ پھر انشاءاللہ کوئی ضرورت نہ رہے گی۔" رخسانہ بچے کو لے آئیں۔ کرنل صاحب نے اسے دیکھا بھالا اور اپنے بیگ سے تیار شدہ انجکشن نکال کر بڑی آہستگی سے بچے کو دے دیا۔

"ڈاکٹر صاحب...! اب تو اسے دورے نہیں پڑیں گے؟" رخسانہ نے پوچھا۔ وہ ان کی بڑی مداح تھیں۔

"نہیں... اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب...! مجھے بے حد شرمندگی ہے۔ آپ کو ہماری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ وقت آپ کے آرام کا ہوگا!" رخسانہ نے اپنے شوہر کا خونخوار چہرہ فراموش کر کے کہا۔ کرنل صاحب نے مسکرا کر جواب دیا:

"میرا آرام یہی ہے کہ میری وجہ سے کسی کو آرام پہنچا۔ اچھا بیٹی! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے بچے کی کیفیت سنا دینا۔ اب انجکشن کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کرنل ص... ! آپ..." رخسانہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں پھر جب وہ چلنے لگے تو چاندی کی طشتری میں کچھ الائچیاں، پان اور ایک معقول رقم ان کی فیس کی رکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ کرنل صاحب نے سرسری نظر طشتری پر ڈالی، ایک الائچی چٹکی سے اٹھالی اور خدا حافظ کہہ کر باہر چل دیے۔ رخسانہ کے ہاتھ میں طشتری لرزنے لگی۔ مگر ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ فیس کے لیے اصرار کرتیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دانش صاحب باہر پہنچانے گئے۔ کچھ خاموش خاموش سے تھے۔ جب تک ان کی گاڑی چلی نہ گئی پورچ میں کھڑے،

دیکھتے رہے۔ پھر چپکے چپکے کچھ سوچتے ہوئے اٹھ آئے۔ نورجہاں کو کہتے سنا:

"کتنے بدنصیب آدمی ہیں! ایک جوان تعلیم یافتہ بیٹا اور وہ بھی بھلا چنگا پلا بڑھا! ہمارا بالشت بھر کا بچہ بیمار ہو گیا تو ہمارے دل پر خنجر چلنے لگے۔ کیا گزرتا ہوگا اس باپ کا دل، جس کا سرمایۂ حیات ایک ہی بیٹا ہے۔ مگر وہ بھی سدا کا بدقسمت ہے۔" یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ مگر دانش کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ انھیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان کا سلوک سب کے ساتھ بے جا تھا۔ انھیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ جب ان کا دو سال کا آتش بیمار تھا تب ان کا دل عدالت میں نہیں لگتا تھا۔ ایک اہم مقدمے کی انھوں نے پیشی بڑھا دی تھی۔ ساری ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ دل دھڑکتا رہتا تھا۔ ہزاروں اندیشے ستاتے تھے... مگر کرنل صاحب... ان کا بیٹا نوجوان ہے۔ ہمیشہ کا بیمار ہے۔ اس کے سب علاج کرا کے وہ ہار چکے۔ وہ زندگی بھر خود فراموش ہی رہے جائے گا۔ دنیا کی کوئی حسرت اس کے حصے میں نہیں ہے۔ کوئی ارمان اس کا پورا نہ ہوگا۔ اس کی آرزو دراصل آرزو ہی نہیں۔ گونگے کا خواب بہرے کا نغمہ اور اندھے کی تڑپ ہے۔

وہ وہیں آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا لیا۔

اتنے میں پھر کوئی آیا۔ توقیر کا چپراسی تھا۔ اس نے سلام کر کے ایک رقعہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا ہے؟" دانش نے پوچھا۔

"جی سرکار! بیگم صاحب حج کرنے جا رہی ہیں۔ کل رات ان کے یہاں میلاد شریف ہے۔ آپ سب کو بلایا ہے اور تاکید کی ہے کہ ضرور آئیں۔"

"ضرور آئیں گے" بے ساختہ دانش کے منہ سے نکلا۔ ملازم جب چلا گیا تو

انھوں نے رقعہ لڑکی کے ہاتھ اندر بھجوا دیا۔

دوسری صبح ناشتے پر انھوں نے رخسانہ سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں شام کو ذرا دیر سے آؤں۔ تم میرا انتظار نہ کرنا۔ بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔ چلی جانا۔"

"کیا کروں میں جا کے؟ میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور منّو بھی گھر پر اکیلی رہ جائے گی۔" ان کی ناراضی دانش صاحب بھانپ گئے۔ خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نظر آئی۔ نرم لہجے میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تمھارا بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم بھی جاؤ اور وحدت کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ وہاں توقیر ہوگی، سریہ ہوگی۔ اس کا جی بھی بہل جائے گا... میں آفس ہی سے وہاں آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ مگر رخسانہ نے بُرا سا منہ بنا دیا اور بڑبڑائیں۔ "بڑا خیال رکھتے ہیں بہن کے جی لگنے کا۔ جی لگ جائے گا بہنو۔"

مگر وحدت نے خواب سینا شروع کر دیے... شاید وہاں وہ بھی ہوں، جس کی دید کی بے چینی نے اس کی آنکھوں سے نیندیں چھین لی ہیں۔ وہ وہاں ضرور ہوں گے۔ وحدت کے دل میں نغمے گونجنے لگے۔ گہرے خمار نے اُس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اور وہ خود بخود مسکرانے لگی۔

دن کے دس گیارہ بجے توقیر ملنے آئی۔ رخسانہ نے اسے وحدت کے کمرے میں پہنچا دیا۔ توقیر نے دروازہ بند کر دیا اور وحدت کے پاس آ بیٹھی:۔

"میری لاڈلی! دیکھ میں تیرے لیے کیا لائی ہوں۔"

"ہائے اللہ... یہ کیا وحشت ہے۔ آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔ پھر دکھا دینا کہ کیا لائی ہو۔"

"بوجھ بھلا۔ میں کیا لائی ہوں؟" توقیر نے دیدے نچا کر پوچھا

شبو بھائی کی شادی کا رقعہ ہے" وحدت بھی ہنسنے لگی۔

"چل پگلی۔ ادھر دیکھ!" توقیر نے کہا اور اپنے پرس میں سے چھوٹے
بڑے کئی سنہرے کیس نکال کر وحدت کو دکھانے لگی ـــــ ایک ڈھکنا کھل گیا
اور اس میں سے کوئی طلائی زیور چمکنے لگا؛ ـــ

"یہ کیا؟ توقیر!" وحدت نے سہم کر پوچھا۔

توقیر نے جواب دینے کے بجائے سب کیس کھول ڈالے اور وحدت
کی آنکھوں کے سامنے خوبصورت سا گلوبند، بروچ، کنگن، انگشتری اور نہ جانے
کیا کچھ چمکنے لگا۔ اس کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔

"یہ سب کیا ہے توقیر؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ توقیر
پُرمسرت انداز میں ہنسنے لگی۔ "اسے لو اور سنو! میری بھولی بھالی فاختہ یہ
بھی نہیں جانتی کہ یہ چاہنے والے کے دل کے ٹکڑے ہیں ... جو پیشِ خدمت
ہیں بکفِ" توقیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تو کیا؟..." وحدت نے ایک نظر زیوروں پر ڈالی، دوسری توقیر
پر اور نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا۔

"یہ درخواست کر کے بھیجنے والے نے بھیجے ہیں کہ ع گر قبول افتد زہے
عزّ و شرف" توقیر نے بہت سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تم نہیں جانتیں کیسا کرب،
کتنی تکلیف اور کیسی حسرت تھی ان آنکھوں میں! اُف۔ میں بھلا نہیں
سکتی۔ پھر انھوں نے بڑی خوشامد سے، بے حد عاجزی سے التجا کی تھی توقیر
میں اس سے بڑی دور کر دیا گیا ہوں۔ شاید میں اس سے عمر بھر نہیں مل سکوں
گا۔ میری زندگی میں حرمان و حسرت کے سوا اور ہے ہی کیا۔ جہاں وہ انبار
ہے ناکامیوں کا وہاں ایک یہ بھی سہی۔ مگر خدا کے واسطے تم یہ چیزیں وحدت

کو پہنچا دینا اور میری طرف سے کہہ دینا کہ اگر قبول کر لیں تو ایک حسرت نصیب دلوانے کی اتنی سی خوشی پوری ہو جائے اور اگر قبول نہ کریں تو واپس نہ کریں پھینک دیں کہیں۔"

مدحت کے موتی سے آنسو زیوروں پر گرنے لگے۔ "تو قیر! ان کی یادیں میری وجہ سے کربناک ہو گئی ہیں... وہ میری زندگی میں رچ بس گئے ہیں، اگر وہ مجھے نہ مل سکے تو پھر... میں کیسے جیوں گی توقیر! میں کیسے جیوں گی؟"

وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"تمہیں کچھ پتہ نہیں مدحت؟ ان کے پیغام کا کیا حشر ہوا؟"

"حشر!" مدحت نے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہے کہ بھائی جان ان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ بھابی اور آپا سے جھگڑے رہتے ہیں۔ بھلا وہ کیوں گوارا کریں گے کہ....؟"

"وہ یہ گوارا کر لیں گے کہ تم موم شمع کی طرح آہستہ آہستہ جلتے پگھلتے بالآخر بجھ جاؤ۔ مگر یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ تمہیں عبیر بھیا کی شکل میں ایک نئی زندگی ملے ... کیسا خدا کا قہر ہے۔ معصوم اور بے زبان بہن پر یہ ظلم!!"

"صبح سے شام تک آٹھوں پہر میں اپنے مرنے کی دعا مانگتی رہتی ہوں توقیر! جس سے زندگی چھین لی جائے اس کا جینا کیا؟"

"میرا دل تڑپتا ہے منو! ادھر عبیر بھیا کو دیکھتی ہوں۔ آہ کتنی بے بسی سے مسکراتے ہیں۔ کاش وہ رویا کریں... ادھر تم ہو... قیدو بند کی صعوبتوں میں گرفتار۔ آخر کب خدا کو رحم آئے گا اُن پہ اور تم پہ؟"

"کیا خدا کے یہاں اتنی دیر بھی ہوتی ہے۔ رحم کرنے اور انصاف کرنے میں اتنی دیر!! جو مظلوم بندوں کے حق میں اندھیر بن جائے؟" مدحت

نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔" اس سے بہتر تو یہ ہے پروردگار موت کو نجات کا تحفہ
بنا کر بھیج دیا کرے ۔ اللہ میاں کے پاس موت سے سستی اور کیا چیز ہے ؟ "

" یوں نہ ہو منو ! ہو سکتا ہے کہ اچانک یہ بادِ سموم بادِ نسیم بن کر تمہارے
اس خزاں زدہ چمنستانِ حیات کو گل و گلزار میں تبدیل کر دے ۔"

" ہاں توقیر ! انسان اگر تقدیر سے ایسی جھوٹی پُرفریب امیدیں نہ لگا رکھے
پھر بد نصیب جئے کیسے ؟ جو آدمی بستر مرگ پر ہوتا ہے ، وہ بھی ہمیشہ یہی سوچتا
رہتا ہے کہ شاید صبح تک یا شاید شام تک وہ بھلا چنگا ہو جائے ۔ مگر وہ مر ہی جاتا
ہے ۔"

" نہیں منو ! نہیں !! خدا کے لیے اتنی ناامید نہ ہو ۔ مجھے پورا یقین ہے ،
جب تمہارے صبر اور خدا کی آزمائش کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا چھلک اٹھے گا ۔
نہیں پیاری ! کہیں خدا بھول تو نہیں گیا ۔"

وحشت ویکہ طعن انگیز ہنسی ہنس کر رہ گئی ۔ دونوں کی خاموشی کے بعد
اس نے پوچھا :

" اچھا شام کو تو ہمارے یہاں آؤ گی نا ؟ میں تمہارا بہت انتظار کروں گی
نا ضرور ۔ ثریا آئی ہے ۔ صبح ہی سے چلی آئی تھی ۔"

" ثریا آئی ہے ؟ "

" ہاں ! جمیر بھائی بھی اس کے ساتھ تھے ۔ صبح ہی کو مجھے یہ سارا چیز لیا
کی تھیں ۔ جب میں ان کے سامنے ہی چلی آئی تو پھر وہ بھی اپنے کام سے گئے ۔"

" اچھا ! "

" تم آنا ضرور منو ! خدا کا واسطہ تمہیں !! کوئی بہانہ نہ کرنا ۔ ورنہ میری
ساری خوشیوں پہ اوس پڑ جائے گی ......" توقیر نے بڑی لجاجت و خوشامد سے

کہا اور جھک کر اس کے ہاتھ چوم لیے۔

"ضرور آؤں گی توقیر!" مدحت نے کہا "بھائی جان نے اجازت بھی دے دی ہے۔"

"سچ سچ؟"

"ہاں!" مدحت ہولے سے مسکرائی۔

پھر توقیر کے جانے کے بعد دیر تک ان حسین و خوشنما زیورات کو دیکھتی رہی، جو سچ مچ ایک چاہنے والے کے دل کے ٹکڑوں کی شکل میں اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔

توقیر کی والدہ حج کو جانے سے پہلے اپنے سامنے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھیں۔ اس کی منگنی تو ہو ہی چکی تھی۔ انھوں نے شجاعت کے یہاں کہلوا دیا کہ جلد از نکاح سے بھی فراغت ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ منگنی کی پرواہ کیے بغیر کسی سے بھی اس کا نکاح کر دیں گی۔ ایک فرض پر وہ دوسرے فرض کو قربان نہیں کریں گی۔ ان کا ارادہ دوبارہ واپسی کا نہ تھا۔ اپنا کل اثاثہ مع مکان و جائداد انھوں نے بیٹی کے نام لکھ دیا تھا۔ لطیفن بوا بھی اس مبارک سفر کی ساتھی تھیں۔

بڑی جلدی شادی ہو گئی۔ جانے سے پہلے وہ اپنے ہر شناسا سے ملاقات کرنا چاہتی تھیں ایک ایک کے یہاں جا کر ملنے سے بہتر انھوں نے یہ خیال کیا کہ ایک مبارک اجتماع منعقد کیا جائے۔ چنانچہ بڑی شاندار محفل ہوئی اور دور دور تک جس کسی کا بھی نام بھولے سے بھی یاد آیا اسی کو دعوت نامہ روانہ کر دیا گیا۔

شباہت کو اس قدر جلد اپنی شادی رچانا ہرگز منظور نہیں تھی۔ اسے جو بہت
شرم لگتی تھی۔ مگر وہ بے حد مجبور کر دیا گیا تھا۔ چار و ناچار بزرگوں کی رضی کے
سامنے سر جھکا دیا۔ عبیر کو پتہ چلا اس نے اسے گرمجوشی سے مبارکباد دی اور ہنستے
ہوئے کہا:

"کل کسی وقت ضرور آنا اور توقیر کو بھی کسی طرح ساتھ لیتے آنا۔ اس کی
پسند کا رنگ کروا دیں گے، اس کی گاڑی پر۔"

"تو تم نے خرید ہی لی آخرکار؟" شباہت نے طویل سانس لے کر لب بھینچ لیے۔
"کہنا نہیں مانا میرا۔"

"دیکھو یار! بگڑنے کی بات نہیں ہے۔" عبیر نے مسکرا کر اس کے کندھے
پر تھپکی دی۔ "تمہیں مشورہ دو کہ آخر میں اپنی بہن کو کیا دیتا؟"

"میں نہ بیٹھوں اس گاڑی میں؟" شباہت نے اتنی بے ساختگی اور بے
سے پوچھا کہ عبیر کو بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ شباہت بھی ہنسنے لگا۔ اتنے میں
سریرہ نے پردے سے سر نکال کر جھانکا اور اپنی عادت کے مطابق بگڑ کر بولی:

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں منے بچوں میں ہنسی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ مجھ پہ سے
خالہ امی کے یہاں سے دو مرتبہ آدمی آ چکا ہے۔ عبیر نے تو ابھی تک کپڑے بھی
نہیں بدلے۔"

"سلام علیکم پھوپھی اماں!" شباہت نے اسے سامنے دیکھ کر تمیز
سے کہا۔

"شبو بھیا! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" سریرہ نے منہ سکوڑ کر کہا۔

"اُف!" اس نے توبہ کرنے کے انداز میں گال تھام لیے۔ "میں بھول
گیا تھا پھوپھی اماں! کہ آپ بے حد بزرگ ہیں اور بے تحاشہ سنجیدہ ہیں۔ کیونکہ

آپ کا دل اُتھل پُتھل ہو رہا ہے۔"

"اوہی اللہ! وہ کیوں؟" مریم نے دیدے نچائے اور حیرت سے بولی۔

"کیونکہ آپ کی ماشاء اللہ چالیس کم ساٹھ سال کی عمر ہو گئی ہے اور بجلی کھپا جھنور کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہاں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں کہ آنے کا نام نہیں لیتے۔" شباہت نے کہا۔ جبیر ہنسنے لگا اور مریم نے جل کر بیٹھے ہوئے لڈو کا جو اس پہ ٹھینگا مارے جو وہ مٹھی میں دبائے تھی اور ایک ایک کھائی جا رہی تھی۔ شباہت نے فرش سے جلدی جلدی کاجو چُنے اور آدھے جبیر کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "لو یار جی بھر کے کھاؤ! جب بھی اماں کو غصہ آتا ہے تب ہی بھتیجوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اللہ کرے اماں کے سر پہ سے کھپل جلدی کھلائے!"

"اللہ کرے کہ آپ کے دو درجن چچکریاں پیدا ہو جائیں۔ شادیاں کرتے کرتے آپ کا بھتیجن نکل جائے۔" مریم نے دانت پیس کر بددعا دی، پھنکار کر پیر زور دار غڑاپ سے اندر ہو رہیں۔ شباہت نے قہقہہ لگایا۔

"میں کہتا ہوں کتنی بے وقوف بچی ہے۔ سنجیدگی سے بڑا مان جاتی ہے۔

یار! اب واقعی چلنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

کرنل صاحب، ثمینہ بیگم اور سطوت جہاں وغیرہ جا چکے تھے۔ جب جبیر و شباہت پہنچے تو بہت سے مہمان آ چکے تھے۔ جبیر چونکہ توقیر کی امی سے زیادہ خلوص و ارادت رکھتا تھا اس لیے اس نے اپنے آنے کی خبر اندر کھلوا دی اور خود ان سے ملنے کے لیے زنانی ڈیوڑھی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ دوسرے لمحے توقیر اندر سے نکلی اور خوشی کے مارے بولی "اللہ میرے جبیر بھائی!" اور فرط مسرت و تاثر سے بیخود ہو کر اس کے بازو سے لپٹ گئی۔ جبیر نے بڑی محبت سے اسے لپٹا لیا۔ توقیر نے اپنی بدحواسی میں شباہت کو نہیں دیکھا۔ اس نے شرارت سے لقمہ دیا۔ "ہم

ـنے کیا قصور کیا ہے؟"

"بکو مت!" جبیر نے اسے ڈانٹ دیا۔ مگر تو تیر جبیر کے ہاتھ سے چھٹ کر
اندر ہی آگ چکی تھی۔ وہ ہنسنے لگے۔ جبیر اتنے میں اس کی امی آگئیں۔ شباہت نے
انھیں شرما کر زمیں دوز سلام کیا، وہ اُسے دعائیں دینے لگیں۔ جبیر نے بڑھ کر ان
کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس سے اسی خلوص سے ملیں جس کے لیے وہ ترس رہا
تھا۔ جانے ان کی مقدس شخصیت میں ایسی کون سی بات تھی کہ ان کے قریب سارے
دکھ درد دور ہو جاتے تھے۔ جبیر بے تاب ہونے لگا۔ نہ جانے کون سی بھولی بسری
یاد، کوئی ذہنی کرب اس کے شعور میں جاگا کہ اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبانے لگیں۔
جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خود کو تنہا محسوس کر رہا ہو۔

"جبیر بیٹا! کیا بات ہے؟" انھوں نے بڑی محبت سے پوچھا ـــ "کیا
رو رہے تھے؟ چلو چل کے اندر بیٹھو، میرے کمرے میں۔" انھوں نے اس کی کلائی
تھام لی۔

"[illegible] نہیں..." جبیر نے کہا اور خاموش ہو کر جیسے سوچنے
لگا۔

"[illegible] کیا ہوا ہے تمھارا؟" انھوں نے پوچھا۔

"ممی... یہ چاہتا ہے کہ میں خوب۔ دل بھر کے آپ کے سامنے رو لوں" جبیر نے کہا
"کیا آپ میری ماں نہیں ہیں؟ کیا میں آپ کے سامنے رو بھی نہیں سکتا؟"

"ہاں میرے بچے! تم میرے بیٹے ہو۔ مگر میں کیسے برداشت کر لوں گی کہ میرا بیٹا
رو رہا ہے؟" انھوں نے اس کا تاثر درہم برہم کر دیا۔ "میں تو دعا مانگتی ہوں
میرے لال! کہ اللہ تم کو ہمیشہ مسکراتا رکھے، تمھارا دکھ درد دور ہو جائے اور کوئی
غم تمھارے پاس نہ پھٹکے، کبھی تمھاری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ یہ تو کمزوری

دو بیوقوف ناسمجھ لڑکیوں کا کام ہے۔ تم ایسے سمجھدار تعلیم یافتہ اور دانشمند آدمی کا کام نہیں... آدمی اگر ہنستا رہے تو کوئی مصیبت، مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔" وہ اسے سمجھاتی رہیں، آہستہ آہستہ نرم آواز، میٹھے لہجے میں۔ "یہ مردوں کی شان نہیں ہے۔ مرد کی آنکھوں میں آنسو زیب نہیں دیتے۔ بیٹا! تم حوصلہ بڑھانے والوں میں ہو۔ حوصلہ کھونے والوں میں نہیں۔"

"پھر میں ایسا کیوں ہو گیا ہوں؟" جبیر نے کہا۔ اسے محفل کے شور و غل، مہمانوں کی آمد اور موقع محل کا کبھی احساس نہ رہ گیا۔ وہ خود کو غالباً اکیلا ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے سرخ سرخ آنسو بھری آنکھوں سے انھیں تکتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے معلوم ہے میں پہلے ایسا نہیں تھا۔ میں شاید دور تک پڑھا ہوا ہوں۔ اپنے کمرے میں کاغذات میں سے متعدد ڈگریاں دیکھی ہیں، جن پر میرا نام لکھا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں میں نے کب کہاں اور کون سی یونیورسٹی میں پڑھا لکھا ہے؟ میں کہاں کہاں گھومتا پھرا ہوں۔ ایک بار سرید نے مجھ سے پوچھا تھا: کیا تمھیں اپنا اصلی نام یاد ہے؟ میں دیوانوں کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگا تھا۔ کیا میں اپنا نام بھی بھول گیا؟"

"ارے یار! چھوڑو ہٹاؤ۔" وقت شباہت بلند آواز میں بولا۔ "میرا اصلی نام بھی خدا بخش تھا۔ میں اسے بھول گیا ہوں۔ کون سا رومینٹک نام تھا۔ تم بھی اپنا اصلی نام 'اللہ یار خاں' یاد کر کے کیا کرو گے؟"

"میاں اصلی نقلی ناموں میں کیا رکھا ہے؟" امی ہنسنے لگیں۔ "سرید نے یوں ہی تمھیں چڑایا ہوگا۔ وہ بچپن سے بہت شریر ہے۔ تم بڑے سیدھے سادھے ہو، اس کے مذاق میں آگئے۔" پھر انھوں نے پوچھا۔ "اچھا مجھے بتاؤ! تمھارا نام کیا ہے؟"

"جبیر، جناب لیتی ہیں؟"

"نہیں۔ یاد کرو! پھر سوچو!!" انھوں نے کہا۔ عبیر دو لمحے سوچتا رہا پھر مسکرا کر کہا۔ "محمد معاذ۔ جی ہاں یہی نام ہے جو میری سندوں پر لکھا ہوا ہے۔"

"دیکھا تم نے! تمھیں سب کچھ یاد ہے۔" وہ ہنسنے لگیں۔

"بیگم صاحب!" ملازم نے دخل دیا۔ "واعظ صاحب آگئے ہیں۔ سب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔" اُن کی گفتگو ختم ہو گئی۔ شباہت عبیر کو لیے ہوئے زنانے میں چلا گیا۔

بڑا ہال تقریباً پُر تھا۔ واعظ بڑی خوش الحانی سے سیرت پاک پر روشنی ڈال رہا تھا۔ لوگ مؤدب بیٹھے تھے۔ ایک ایک لفظ عبیر کے دل میں اُترا جا رہا تھا اور آنسوؤں کا ہجوم اس کی آنکھوں میں اکٹھا ہونے لگا تھا۔ اس نے رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر وعظ ختم ہوا اور دیر تک درود و سلام کی پُرکیف گونج ماحول پر طاری رہی۔

"اب کچھ آپ بھی سُنا دیجیے معاذ صاحب!" ایک واقف کار نے اُس سے کہا۔ "کوئی وجد آفریں سلام یا نعت۔ شکریہ۔"

اس نے ماحول پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ جہاں جہاں نظر کام کرتی انسانی سر دکھائی دیتے رہے۔ اُسے مستعد و آمادہ دیکھ کر بے شمار نظریں اُس پر اُٹھ گئیں۔

اس نے اپنی پُرسوز و دلکش آواز میں سورۂ مزمل شریف کی تلاوت کی اور سننے والوں کو مدہوش کر دیا۔ پھر ایک نعت پڑھی۔ اس کی آواز میں دنیا بھر کا سوز اور تمام کی تمام دلکشی سمو گئی تھی۔ وہ کھڑا ہوا سر جھکائے نعت پڑھ رہا تھا۔ سارے سامعین ہاتھ باندھے مؤدب ایستادہ تھے جیسے وہ دنیا کے

سب سے بڑے شہنشاہ کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔

در و دیوار تک گویا اس کی وجد آفریں آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ اور باقی ساری کائنات پر سناٹا چھایا ہوا تھا ؎

جلوہ نما شد آفتاب صلِّ علیٰ محمدٍ — مہر برآمد از سحاب صلِّ علیٰ محمدٍ

شد بمدینہ جلوہ گر ساقیٔ راحتِ جگر — ریخت بہ جام از لب صلِّ علیٰ محمدٍ

شوقِ تو کردہ بر تعب ہجرِ تو کردہ جاں بلب — شد جگرم چو خونِ ناب صلِّ علیٰ محمدٍ

دل شدہ مبتلائے تو روح شدہ فدائے تو — اے کہ فراقِ تو عذاب صلِّ علیٰ محمدٍ

جان و دلم ہمہ خراب ز آتشِ ہجر شد کباب — روحِ من از ہمہ اضطراب صلِّ علیٰ محمدٍ

آرزوئے لقائے تو دل کہ نمود جائے تو
عفت خستہ و خراب صلِّ علیٰ محمدٍ (عفت موہانی طبع زاد)

لگ بھگ بارہ بجے کے قریب ڈنر کے بعد محفل اختتام کو پہنچی۔ لوگ رخصت ہو گئے رونق دم توڑنے لگی۔ پھر حرف گھر والے جانے لگے۔ تب توقیر کی امی انھیں رخصت کرنے باہر تک آئیں۔ بیرسٹر دانش بیگ تو شال میں لپیٹے کھڑے رخسانہ پر بگڑ رہے تھے "دیکھا اس گدھے کو معلوم نہیں تھا کہ ہم واپس بھی جائیں گے۔ کار لے کر کم بخت کیا رفو چکر ہو گیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب ٹیکسی کرنی پڑے گی"

اتنے میں جمیر کو دیکھ کر اس کا ڈرائیور تیزی سے گاڑی قریب لے آیا۔ جمیر نے دانش صاحب پر ایک نظر ڈالی اور بڑے ادب سے کہا۔ "انکل آپ پسند کیجئے تو میری گاڑی میں تشریف رکھیے۔ میں آپ کو گھر چھوڑتا ہوا گھر چلا جاؤں گا" یہ کہہ کر وہ بیچ کی طرف سے انھیں، رخسانہ اور ان کی بیوی کو گاڑی میں بٹھا کر وحشت کو دیکھنے لگا۔ بیرسٹر صاحب کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ مگر اس کی بات ٹال دی۔ تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے جمیر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔ اور گاڑی سڑک پر بھاگنے لگی۔ ان میں کوئی بات نہیں ہو رہی —

پھر کار دانش صاحب کے بنگلے پر پہنچ کر رک گئی۔

جبیر نے سیٹ سے اتر کر ان سے رخصتی مصافحہ کیا اور بڑی عاجزی سے جھک کر کہا "اچھا جناب! خدا حافظ!!"

اس کا ہاتھ دانش نے تھام لیا اور مسکرا کر کہا "چلے آیئے۔ کافی وغیرہ پی کر چلے جایئے گا۔ سردی زیادہ ہے۔ آپ کو غالباً کچھ جلدی بھی نہیں"

رخسانہ کا دل اچھل کر رہ گیا۔ تو کیا آج پھر۔۔ وحشت کی سانسیں پھولنے لگیں۔ وہ کافی کے انتظام میں جلدی جلدی اندر بھاگی۔

"میں ابھی واپس آتا ہوں۔ عبدالکریم صاحب!۔۔۔ آپ میرا انتظار کیجئے!" اس نے شوفر سے کہا اور مڑ کر بیرسٹر صاحب کے ساتھ چلا گیا!۔ غالباً انھوں نے اس کے ذہنی امتحان کے لیے اسے بلایا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر السٹر پہنتے ہوئے بولے:

"آپ کا کیا خیال ہے یہ سردی کی لہر اور کب تک رہے گی؟"

"میں سمجھتا ہوں جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ نسبتاً تو کم ہے"

وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولے "آج تو آپ نے کمال کیا جبیر صاحب! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اپنے فن میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے کبھی پھر سنوں گا وہی سلام۔ واللہ آپ نے روح کی گہرائیوں کو چھو لیا!"

"شکریہ جناب" وہ سر جھکا کر انکساری سے بولا "فن اس لیے کمال کو پہنچا کہ اسی کی تو روٹی کھاتا ہوں"

"کیوں کیوں؟۔۔۔" وہ گویا چونک کر بولے "ماشاءاللہ کرنل صاحب کا سرمایہ تو آپ ہی کا ہے۔ ان کا اور ہے ہی کون آپ کے سوا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو محنت کی ضرورت ہی نہیں ہے"

"مجھے ڈیڈی کے حال پر رحم آتا ہے" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "کیا کچھ نہ سوچا ہوگا انھوں نے میرے متعلق! لیکن ان کی ساری امیدیں ختم ہو چکیں۔ کاش میں کسی قابل ہوتا۔ اپنے باپ کا عصائے پیری بن سکتا! ان کے بڑھاپے کا سہارا ہوتا! اب تو یہ حال ہے کہ میں بوجھ بن گیا ہوں۔ کیا مجھے اس کا احساس نہیں ہے بیرسٹر صاحب کہ میں کچھ کرتا دھرتا نہیں... وہ مجھے کچھ کرنے بھی نہیں دیتے اتنی بے پایاں محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ مجھے سینہ سے لگا کر روتے ہیں۔ میرے لیے برباد ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں ایک زہر کا انجکشن دے کر کیوں میری زندگی ختم نہیں کر دیتے"

"اس طرح نہیں سوچنا چاہیئے مسٹر جمیر!" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "آپ خدا کے فضل سے جوان ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، ایک بڑے قابل اور ہونہار فنکار ہیں"

"آپ جیسے فن کہتے ہیں وہ دوسروں کے لیے بکواس ہے" جمیر نے کہا۔ "لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں، کتراتے ہیں، مجھے پاگل سمجھتے ہیں اور صاف صاف دیوانہ بتاتے ہیں اور انھیں ذرا بھی خیال نہیں آتا کہ وہ میری دلشکنی کر رہے ہیں، دلشکنی گناہ ہے بیرسٹر صاحب! اگر میں کسی [illegible] اپنے اس کھو بیٹھا ہوں تو یہ میرا اپنا مرض ہے۔ وہی لوگ [illegible] [illegible] سے محبت ہے۔ [illegible] کو کیا حق ہے کہ وہ مجھے دیوانہ [illegible] [illegible] اس بیچارگی سے رو دیتا ہوں"

اتنے میں ملازم کافی کی ٹرے [illegible] اہتمام کیا گیا تھا گرم گرم توس تھے تلے ہوئے بادام اور آلو کے [illegible] [illegible] کی پلیٹ بڑا اور بھرا ہوا تھا۔

"لیجئے جمیر صاحب! [illegible] [illegible] لیجئے" بیرسٹر صاحب

جو ہمیشہ تیوریاں چڑھائے رہتے تھے، اپنی عادت کے برخلاف ہنستے ہوئے بہت اچھے لگے۔

"جی! ابھی ابھی تو سب کھا پی کے چلا تھا۔" جیبر نے کہا۔ مگر آگے سرک آیا۔

پھر کافی کے دوران میں بیرسٹر صاحب نے کہا:

"آپ سوچتے بہت ہیں۔ سوچنے والے ہمیشہ قنوطی ہوتے ہیں۔ سمجھے آپ!"

اس نے ہولے سے ہنس کر بڑے دل نشیں پیرایے میں کہا: "سوچوں ہی کا تو سرمایہ رہ گیا ہے بیرسٹر صاحب! میرے پاس... میں سوچتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو جس طرح سب ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں میں بھی کرتا اب تو میں سہتے سہتے تھک گیا ہوں۔ برداشت کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ میں نے کتنی مرتبہ اپنی توہین گوارا کی ہے۔ دانش بھائی! مگر میں خاموش ہو گیا۔ میں جب ایسا ہوں تو پھر کیوں بُرا مانتا ہوں... ڈیڈی ایک دردناک تمسخر ادا کرنا چاہتے ہیں۔ جانے کہاں میرے لیے پیغام بھجوا دیا ہے۔ ان کی خاطر سے میں چپ رہا ہوں۔ مگر سوچتا ہوں کیسے میں خوش رہوں گا اور کیسے خوش رکھ سکوں گا اس بدنصیب کو، جو مجھ سے وابستہ ہو جائے گی۔"

"اچھا!" دانش صاحب نے بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر جب خانم آکر برتن بڑھا لے گئی تو وہ بھی اٹھنے لگا اور ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا:

"خدا کے لیے یہ باتیں ڈیڈی سے نہ کہیے گا۔ وہ بچے کے علاج کے سلسلے میں یہاں آتے رہتے ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو گیا! میں اپنے پاگل پن کا ادراک رکھتا ہوں، وہ انھیں بہت [illegible] ملول کریں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا دانش بھائی! آپ جانتے ہیں، صرف ان کے لیے [illegible] رہا ہوں۔ ورنہ یہ کھوکھلی کھوکھلی میری زندگی! افسوس! [illegible] کے قابل نہیں نہ آپ کے، نہ میرے۔"

یہ کہہ کر وہ جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے فرش کو تکنے لگا اور آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ ان آنسوؤں پر وہ اس قدر شرمندہ تھا کہ فرطِ خجالت سے سر بھی نہ اٹھا سکا۔ پھر رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور بچوں کی سی ہنسی ہنس کر کہا "اب مجھے اجازت دیجیے دانش بھائی! ڈیڈی میرے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے.... اچھا خدا حافظ!" اور الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

پھر وہ تو چلا گیا۔ مگر دانش پر اس کے آنسوؤں کا عجیب اثر ہوا۔ گم صم بیٹھے رہے اور سوچتے رہے اس نے اپنی گفتگو میں بے ربطی کا مظاہرہ کہاں کیا تھا؟ بوکھلایا کہاں تھا؟ گڑبڑایا کب تھا؟ مگر انھیں کچھ بھی یاد نہ آیا۔ انھیں احساس ہوا، اس کی ساری گفتگو ہوشمندوں کی سی تھی، صداقت آمیز، پرخلوص لیے رہا۔ ایک معصوم بچے کی سی بے نفسی، جو اپنے چاہنے والے کے سامنے دردِ دل عیاں کر دیتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اس سے کہیں بہتر کر [illegible] سچ بھائی بھائی کا خون سفید ہو سکتا ہے۔ مگر انسانیت کا خون کبھی سفید نہیں ہو سکتا، وہ بہر حال رنگ لاتا ہے۔

جمیر نے انھیں محبت کا سبق سکھایا تھا۔ حالانکہ وہ نہیں جانتا [illegible] قانونی آدمی تھے اور تعزیرات ہند میں محبت کا کوئی باب نہیں ہے۔

توقیر کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے وہ حسب پہلے ہی پہنچ گئی کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ گھر کا کام سنبھالتی اور ساتھ ساتھ توقیر کو بھی سمجھاتی [illegible] کر [illegible] [illegible] سے بہت پریشان اور مضطرب تھی۔
گرمیوں کا [illegible] آغاز ہونے لگا تھا۔ برآمدے میں حصیر بچھائے [illegible]

سلائی میں لگی رہتیں جو سامان سفر درست کرتیں اور توقیر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی دنیا بھر کی باتیں کیا کرتیں ... امّی کو بہت دکھ تھا۔ توقیر کی جدائی کا احساس انھیں بے کل کیے رہتا۔ وہ اپنی سسرال میں ہوگی اور وہ خود دیار کعبہ و مدینہ میں۔ پھر وہ اپنی بچی کو کبھی نہیں دیکھیں گی۔ کون جانے وہ خوش بھی رہے کہ شاید بہت اسے کوئی دکھ پہنچائے۔ اگر اس کا دل کڑھا تو ماں کا آنچل بھی پناہ کے لیے نہیں ملے گا۔ روئے گی، بیتاب ہوگی اور ماں کو یاد کرے گی۔

اس وقت بھی یہی خیال آیا اور سوئی چھوڑ کر انھوں نے آنچل آنکھوں پر رکھ لیا ــــ "آہا! یہاں تو دوکان لگی ہے" دفعتہً انھوں نے جبیر کی آواز سنی اور جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ پھر خوش ہو کر بولیں "بڑی عمر۔ میں تمھیں یاد کر رہی تھی۔"

"کیوں امّی؟" "کوئی خاص بات؟" ــــ وہ پتلون چڑھا کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے توقیر کے جہیز کے ملبوسات پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ہاں بیٹا!" انھوں نے کہا "کچھ کہنا تھا تم سے۔ میرے بعد اپنی بہن کا خیال رکھنا۔ اب تو تم ہی اس کے ہو جو کچھ ہو۔ بھائی کہ باپ کہ دوست"

"توقیر میری زندگی کے ساتھ ہے امّی!" اس نے کہا "لیکن میں تو کچھ اور سوچ کر آپ کے پاس آیا تھا۔"

"کہو بیٹا! کیا بات ہے؟"

"میں سوچتا تھا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔ نہ جانے امریکہ، افریقہ، انگلینڈ، آکسفورڈ اور کہاں کہاں کی خاک چھان آیا۔ نہ گیا تو وہاں جہاں سب سے پہلے جانا چاہیے تھا۔"

"ہاں بیٹے! ضرور چلنا چاہیے" وہ بولیں "مگر اس میں تو بہت دن

لگیں گے۔ اللہ تمہارا ارادہ مبارک کرے۔ پھر ہو آنا۔"

"جی... " وہ پرخیال انداز میں بولا۔ پھر پوچھا " ٹھیک ہے اچھا میں ذرا توقیر سے مل کے آتا ہوں... کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ آج میرے پاس نہیں آئی۔"

توقیر زرد لباس میں لپٹی بانجھے بیٹھی تھی۔ اپنے کمرے میں جبیر کو دیکھ کر بہت شرمائی اور ہرا آنچل اوڑھ کر سر جھکا لیا۔

"توقیر!" وہ اس کے پاس پہلو میں جا بیٹھا۔" نہ گھبراؤ! تم اپنے آنسوؤں سے اتنی سی عزم و ہمت کے چراغ کو گل نہ کرو۔ وہ اگر جا رہی ہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ کیا میں تمہارا کچھ بھی نہیں توقیر؟ نہ باپ، نہ بھائی؟ نہ دوست؟ کیوں توقیر؟"

"جبیر بھائی!" وہ بولی اور سسکتی ہوئی اس کی آغوش میں گھس گئی۔ دفعتاً دروازے کے فریم میں ایک حسین و جمیل شبیہ نظر دکھائی دی جیسے زندہ تصویر، باحس و حرکت، متحیر سی... جیسے سان گمان بھی نہیں تھا کہ وہ جبیر کو اپنے سے اس قدر قریب دیکھ سکے گی۔

"مدحت!" جبیر کے لب گنگنانے لگے۔

"اف!" مدحت نے سر جھکا لیا۔ توقیر نے دونوں کو متحیر و مبہوت دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا " جبیر بھائی۔ نہ سلام نہ کلام۔ آپ دونوں اتنے گم صم کیوں ہو گئے؟"

مدحت نے جلدی جلدی آنچل انگلیوں پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ جبیر نے اپنی وارفتگی پر قابو پا کر کہا " آؤ مدحت! خوش آمدید!!..... بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو تو بجز اسی روز

آتا تم سے ملنے کے لیے ۔"

"کیوں ؟" توقیر نے پوچھا ۔ اور یوں چونکا جیسے اس کی موجودگی بھول گیا ہو ۔ پھر ہنستے ہوئے کہا "کیونکہ یہ کہیں نہیں ملتیں ۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں آخری مرتبہ ان سے کب ملا تھا ۔"

"آؤ منو بیٹھو نا !" توقیر بولا ۔ پھر دفعتہً اٹھتی ہوئی مدحت کو گھورنے لگی ۔ "تم نے بھلا شاہی ٹکڑے کیوں پکائے ہوں گے ۔ میں ہی دیکھوں گی جا کر ۔ باورچی سب کچھ چوپٹ کر کے رکھ دے گا ۔" اور دونوں کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر کمرے سے نکل گئی ۔ جبیر جھکا اور اس نے مدحت کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے کمر پہ سر ٹیک دیا ۔ مدحت خوفزدہ تھی ۔ وہ تو مدہوش تھا اسے دنیا اور سماج کا کیا خوف تھا ۔ مگر اس کی پوزیشن بڑی خراب ہو جاتی کوئی آ کے اگر دیکھ لیتا ۔

"مدحت ! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا اگر تم سے پیار کیا ۔ پھر یہ ملنا کیسے کہ مجھے ملنے کا موقع دیا جائے ۔"

"سنئے ! کوئی آ رہا ہے ۔ مجھے چھوڑ دیجئے ۔" مدحت اس نازک سی کلی کی طرح لرز گئی جس پر بارش کا پہلا قطرہ پڑ گیا ہو ۔ اس نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کی اور جبیر کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی ۔

"اچھا ہے کوئی ہمیں دیکھ لے اس طرح پاس پاس ۔ پھر ہمارے زیادہ پاس آنے میں دیر نہ لگے گی ۔" جبیر نے کہا اور بڑی ملتجی آنکھوں سے مدحت کا چہرہ تکنے لگا ۔

"پاس نہیں ہو پائیں گے ۔ زیادہ دور کر دیے جائیں گے ۔" مدحت نے چپکے سے کہا اور اس کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر آنکھیں چرانے لگی ۔

"کیوں ؟ ... میں پوچھتا ہوں آخر کیوں ؟؟ کیا محبت جرم ہے ؟ گناہ ہے ؟"

وہ جھلّا گیا۔ چیخنے لگا۔ "کہاں ہیں وہ عقل کے بقراط و سقراط، جنھیں فنا نہیں ہے، جنھوں نے زندگی بھر کوئی تمنّا نہیں کی۔ بے نفس جئے اور بے غرض مر گئے۔ یہاں کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے جس نے بغیر آرزو کے پہاڑ سی زندگی بسر کر لی؟ یہاں کسی نے کسی کا انتظار نہیں کیا؟ بے چین نہیں رہا، بے خواب ساری رات تڑپ تڑپ کے نہیں کاٹی؟ کیا ان عقل کے پیکروں کو صرف عقل و خرد ہی ملی اور کچھ بھی نہ مل سکا؟ پھر مجھے اپنی تمنّا سے دستکش ہونے کی نصیحت کون کرتا ہے؟ میں بھی تو مر جاؤں گا ایک روز۔ میری ساری خواہشیں ہمراہ ہوں گی میرے جنازے کے۔ کیسے کیسے ساتھی ہیں! آہا! انتظار ہے، انتظار کا دکھ ہے، مردہ تمنّائیں ہیں، نارسائی کی تلخی ہے، شبِ تنہائی کا کرب ہے، گریہ و نالہ ہے .... اور پھر .... تم سنگدل، ظالم لوگ کہتے ہو کہ میرا دل نہ پھٹے، میں نہ مروں — ہاہاہا!" اس کے وحشیانہ قہقہے گونجنے لگے۔ راحت پلٹی۔ بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر ہانپنے لگی۔ تو تیر، امّی اور ابّا سب بھاگی آ رہی تھیں۔ دروازے پر ٹھٹک گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ جبیر دروازے پر کھڑا تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے، آنکھیں انگارا ہو رہی تھیں، چہرہ بھیانک ہو گیا تھا، تیا نے سے مرنے مارنے کے تیور ہویدا، انداز میں ایسی بربریت کہ اگر کسی کو دبوچ لے تو زندہ نہ چھوڑے۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا بیٹے؟" امّی نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے انھیں غصّہ دلا دیا؟" ان کی بات جبیر نے سن لی۔ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "بس وہی ہے ایک چہرہ جو مجھے غصّہ دلاتا ہے۔ کہ کہ اگر مجھے مل جائے تو زمین و آسمان کی قسم، خدا کی قسم میں اس کے پرخچے اڑا دوں گا۔ پھر کوئی امنگ نہ بھٹکے گی اسے دیکھ کر۔ آہ کیا چہرہ تھا؟ وہ لبریز ساغر کی سی آنکھیں، برق کے کوندے کے سے لب .... صبحِ ازل جبیں سے آشکار وہ پیشانی — مگر وہ کہاں ہے؟ .... ایک گیت آگے پیچھے گونج رہا تھا۔ وہ چہرہ ہجوم کے درمیان سرک رہا تھا لیکن میرے اعصاب پر وہ بارات سوار

ہے۔ وہ کہاں گئی؟ میرے گرد وپیش ایک جہنمی تاریکی چھوڑ گئی۔ انتقام۔ انتقام!
ایک ایک فرد سے ۔۔ سنا تم نے ۔۔ انتقام؟"

"خالہ امی! شبّو بھیا کو بلا بھیجئے جلدی سے" مدحت تھر تھر کانپ رہی تھی۔
مگر امی جی کڑا کر کے آگے بڑھیں اور اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے اسے آواز
دی ۔۔ وہ تو اپنے آپ میں نہیں تھا۔ عورتیں متوحش تھیں۔ امی نے گلاس بھر
پانی منگوایا اور یکبارگی اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ وہ جھجکا، پیچھے ہٹا اور دیوار
سے ٹک کر ہانپنے لگا

"جعفر!... جعفر میاں!!... میرے بچے۔ میرے بیٹے!!!"
"جی!" اس نے بھرائی آواز میں کہا اور مضمحل انداز میں انھیں تکنے لگا۔ انھوں
نے قریب آکر اس کا چہرہ اپنے آنچل سے پونچھا۔ ہاتھ تھام کر بستر پر لا بٹھایا۔ اب وہ
نسبتہً پرسکون تھا۔ پھر بھی حواسوں میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔

"بیٹا! کھانا کھاؤ گے؟" بوا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"کھا لیا تھا سہ پہر کے ساتھ" اس نے سر جھکا لیا اور فرش کو تکنے لگا۔ اسے
پرسکون ہونے کے لیے سب نے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر کسی نے اسے نہیں چھیڑا۔ مبادا
پھر بگڑ جائے۔ مدحت اپنے ساتھ توقیر کو لے گئی اور سرگوشیوں میں بتانے لگی کہ اچانک
اسے کس طرح غصہ آ گیا تھا۔

"اب کیا ہو گا منو؟" توقیر بولی "وہ ایسے ہیں کہیں تیرے خیال کا نازک
شیشہ نہ ٹوٹ جائے۔ تم تو ان کی یاد میں زندگی گزارتی ہو۔ اللہ۔ اللہ۔۔"
"تو کیا؟" مدحت محبت کے نشے میں ملی جلی مسکرائی ؎

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

ان کی یاد میں جینا۔ ان کے غم میں مرنا۔ اب تو یہی ٹھانی ہے۔"

"مگر دانش بھائی ؟"

"موت زمان و مکان پھلانگ جاتی ہے توقیر! دانش بھائی کب اسے روک سکتے ہیں کہ میرے پاس نہ آئے" وحت بولی۔

"بوا وہاں آکر بیٹھ گئیں" اللہ نے خیر کی۔ ابن میاں اب بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔ بی بی ہم نے تو پہلی مرتبہ دیکھا انھیں اس حال میں۔۔ کلیجہ ہمارا منہ کو آگیا۔ خدا اس کے ماں باپ پر رحم کرے۔ اچھا جاؤ تم دونوں کھانا کھا لو بچھرا سی گیا ہے شبو میاں کو بلانے" یہ کہہ کر وہ وہیں دری پر لیٹ گئیں۔ توقیر اور وحت اٹھ گئیں۔ تقریباً گھنٹے بھر بعد شباہت گھبرایا ہوا آپہنچا۔ حالانکہ وہ توقیر کی امی سے بہت شرماتا تھا۔ مگر اب کیسی شرم؟ کہاں کی حیا؟ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر قریب قریب روتا ہوا بولا "کہاں ہے خبیر؟ کیا اسے دورے نے پھر خراب کیا؟ خالہ امی! کیا ہوا اسے؟"

"امی تفصیل سے اسے سارے واقعات بتاتے ہوئے بولیں۔۔ "اب تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے بستر پر لٹا دیا تھا۔ سو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ جاگنے کے بعد دورے کی سی کیفیت نہ ہو۔ آؤ بیٹھو"

"جی ابھی آیا۔ ایک نظر اسے دیکھ لوں" شباہت نے کہا اور بوا کی ڈیوڑھی میں کمرے کی طرف چل پڑا۔ دروازے ہی سے اسے دکھائی دے گیا۔ توقیر کے بستر پر اسی کے زرد زرد تکیے پر سر رکھے خبیر سو رہا تھا اسی کی زرد دشالہ اس نے گردن تک اوڑھ رکھی تھی۔ شباہت ایک سانس لے کر پلٹا اور امی کے پاس آ بیٹھا۔ گھر پر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکیاں دوسرے کمرے میں چھپ گئی تھیں۔ بوا کھانا نہ آئیں۔ امی نے شباہت کے لیے الگ میز بچھا دی۔

"مجھے بالکل بھوک نہیں لگی" شباہت نے کہا "آپ نے خواہ مخواہ زحمت

کی ہے؟"

"بیٹا! ہم سب کے لیے پیٹ کا جہنّم بھرنا بھی ایک فرض ہے۔ اس میں تکلف کیسا۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ توقیر بیچاری نے بڑے اہتمام سے اپنی میاں کے لیے شامی کباب پکائے تھے۔ وہ یونہی رہ گئے۔"

"کیا جبیر نے کھانا نہیں کھایا خالہ امی؟"

"نہیں بچے!... ویسے ہی بھوکے سو گئے۔"

شباہت نے کرسی پیچھے کھسکالی اور ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے "خالہ امی میں آپ کے پاس کھانا ضرور کھاؤں گا۔ مگر پہلے جبیر کو بیدار ہو جانے دیجئے خالہ امی! خدا کی قسم! اس کے بغیر میرے حلق سے ایک لقمہ بھی نہ اترے گا۔"

"اچھا میاں جیسی تمھاری مرضی۔" دونوں باتیں کرنے لگے۔ لوا کھانا پڑا رہ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ ساری دوپہر گزر گئی۔ پھر عصر کے وقت جبکہ کہیں قریب کی مسجد میں غمناک آواز میں کوئی مؤذن اذان دے رہا تھا۔ یکایک جبیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے کہا "خدا کی پناہ! توقیر کے بستر پر... یہ کیسی نیند مجھے آ گئی۔ ارے کسی نے مجھے جگا نہیں دیا۔" شباہت جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا اور ہنسنے لگا۔ "عجیب آدمی ہو یار! چار گھنٹے سے بیٹھا میں مکھیاں مار رہا ہوں۔ مگر حضور نہ اب بیدار ہوتے ہیں نہ تب۔"

"جگا لیتے تم مجھے۔ کتنے شرم کی بات ہے۔ میں توقیر کے بستر پر سویا — لاحول ولا قوۃ۔ وہ کیا سمجھے گی؟" جبیر نے بڑی ندامت سے کہا اور اٹھ کر جلدی جلدی زرد چادر کی تمام شکنیں درست کر دیں۔ پھر دونوں باہر آئے۔ اب جبیر پر پچھلے جنونی دورے کے آثار نہیں تھے۔ بہت سلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شباہت سے اس کی آمد کی وجہ پوچھی۔ پہلے تو وہ سٹپٹایا پھر جان بوجھ کر کھسیا اور ہنسنے لگا

ہوا کہنے لگا۔ "مجھے شاہی ٹکڑوں کی خوشبو کھینچ لائی یار۔"

"اوہو! اچھا۔" جبیر ہنسنے لگا اور امی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لائیے امی کھلا دیجئے اس ندیدے کو شاہی ٹکڑے۔ آفس سے بھاگ آیا ہے۔" اس نے یہ نہیں سوچا کہ شباہت تک ان کی خوشبو کیونکر پہنچی۔

پھر کھانے اور چائے کے بعد شباہت نے امی سے اجازت چاہی۔ شباہت نے جبیر کو اس کے بنگلے پر چھوڑا۔ کرنل صاحب موجود تھے۔ اکیلے میں ان سے آج سارا واقعہ کہہ سنایا۔ پھر بولا

"میں کلب جا رہا ہوں چچا جان... راستے میں جبیر نے کہا تھا کہ ان کی طرف سے منیجر کو چیک دے آؤں اور معذرت بھی کر آؤں، بہت دن ہو گئے کنسرٹ کیے۔

"سنو میاں!" کرنل صاحب ایک رنجیدہ آہ بھر کر بولے۔ "کیسا کلب، کہاں کا کنسرٹ... جبیر تو سب کچھ بھول بھال گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس بات کو محسوس کریں۔ لہٰذا میں نے وہ چیک منیجر کے نام سے منیجر ہی کو دیا تھا کہ کنسرٹ کے معاوضے کے طور پر جبیر کو عطا کر دیں۔"

"مگر میرے سامنے جبیر نے دھنیں ترتیب دی تھیں۔" شباہت کی آنکھیں تعجب کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"نہیں بیٹا وہ کچھ نہیں۔ بیکار کے راگ چھیڑ لیتے ہیں۔ اصلی چیز جسے فن کہتے ہیں وہ اس بدنصیب کے ذہن سے فراموش ہو گیا۔"

شباہت کے دل میں ایسا درد اٹھا کہ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

بیرسٹر صاحب نے آخر ایک ماہر نفسیات کا کھوج لگا ہی لیا۔ سنا تھا کہ انھوں نے کئی ایک پیچیدہ دماغی کیس نپٹائے تھے۔ انھوں نے ان سے ملنے کا وقت

لیا اور پھر کرنل صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا:

" مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے پہلے ہی اس طرف توجہ نہیں دی بہرحال اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر کا پتہ معلوم ہوا ہے آپ اگر فرمایئے تو انھیں کو لے کر حاضر خدمت ہوں یا پھر آپ اور معاذ صاحب غریب خانے تک تکلیف کریں۔ ہم سب ساتھ ہی ڈاکٹر کے پاس چلیں "

کرنل صاحب کو تعجب بھی تھا اور خوشی بھی۔ بھلا پتھر میں کیونکر جونک لگی۔ بڑے شکرگزار لہجے میں بولے " میاں جیسی آپ رائے دیجئے۔ میں تو دن بھر بیکار ہی رہتا ہوں۔ جس وقت آپ کہیں گے معاذ کو لے کر چلا آؤں گا۔ یا اگر مناسب خیال کریں تو ڈاکٹر صاحب ہی کو گھر لے آیئے۔ ہو سکتا ہے وہ گھر کا اور اس کے محل وقوع کا اندازہ کرنا چاہیں۔ جیسا کہ اکثر نفسیاتی معاملات میں ضروری ہوتا ہے "

" جی ہاں! جی ہاں!! " دانش نے کہا " اس اہم نکتے کی طرف میرا خیال نہیں گیا تھا۔ میں آج ہی شام کو انھیں لے کر دولت خانے پر حاضر ہوں گا "

" بہت اچھا بیٹا! خدا تمھاری عمر دراز کرے۔ کچھ تو ہمت بندھی ہے "

پھر سلسلہ منقطع کرنے کے بعد دیر تک کرنل صاحب سوچتے رہے کہ کیا وجہ ہے جو دانش صاحب نے اس قصے میں دلچسپی لی ہے۔ مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکے۔ دراصل دانش معاذ سے متاثر ہو گئے تھے۔ پچھلے دنوں انھوں نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا تھا۔ اور اسے ہر طرح شریف و مہذب صورت و سیرت میں اعلیٰ دیکھا تھا۔ اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اس کا دماغی نقص دور ہو جائے تو وہ لاکھوں میں ایک آدمی ہے۔ جبیر کے بڑے ہمدردوں میں ہو گئے تھے۔

کرنل صاحب نے جبیر سے بھی کہہ دیا۔ شام کو ملاقات کی غرض سے کوئی صاحب آنے والے ہیں۔ وہ گھر ہی پر رہے۔

"مگر وہ کوئی ڈاکٹر ہے تو میں ابھی سے اجازت چاہتا ہوں" جبیر نے کہا

"کیوں بیٹے؟" کرنل صاحب بے حد حیران ہوئے۔

"کیونکہ میرا مرض اگر کچھ ہے تو وہ چارہ گروں کی دسترس سے باہر ہو چکا ہے۔ میں ان لوگوں کے ہاتھ میں خود کو تختۂ مشق بنانا پسند نہیں کرتا ڈیڈی!" اس نے نہایت تلخ ناخوشگوار اور کسی حد تک گستاخ لب و لہجے میں کہا۔ جس کے اختیار کرنے کا وہ عادی نہ تھا۔ جیسے سننے کے کرنل صاحب عادی نہیں تھے۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیئے جبیر!" کرنل صاحب نے مدھم آواز میں کہا "تقدیر کو بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو رحم آ جائے۔ بعض دفعہ بڑے بڑے امراض میں خدا نے راکھ کی چٹکی کو خاک شفا بنایا ہے۔"

"بنایا ہوگا" اس نے بے رحم انداز میں جواب دیا۔ "مگر میرے مرض میں نہیں بنائے گا کیونکہ خدا نے اپنے اصول بدل دیئے ہیں" یہ کہہ کر وہ مڑا اور کرنل صاحب کا جواب سنے بغیر چلا گیا۔۔۔ وہ کچھ مضطرب اور مغموم سے دکھائی دینے لگے۔

سحر تخت کے کونے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی اور سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ چائے ختم کر کے اٹھی اور پاؤں پٹختی باہر جبیر کے سر پر جا پہنچی۔ وہ ابھی تک برگشتہ اور برہم تھا۔ چہرے پر اتنی زیادہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی کہ پل بھر کے لیے سحر بھی ڈر گئی۔ پھر جی کڑا کر کے اس کے قریب گئی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔

"کیا تم لوگوں نے طے کر رکھا ہے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی سکون سے نہ

رہنے دوگے ؟

"بھائی جان کی محبت کا یہ جواب نہیں ہے عبیر! جو تم نے دیا ہے" سرور رنجیدہ سی بولی: "ان کی محبت کا جواب....؟"

وہ سرور کا ہاتھ ہٹا کر کھڑا ہو گیا — "نہ میں نے کبھی دیا ہے اور نہ کبھی دوں گا۔ کیونکہ میں وہ پیرایہ ہی نہیں جانتا۔ مجھے بخوبی احساس ہے۔ میں صرف گوشت کا پہاڑ ہوں۔ بوجھ ان پر۔ مجھے شرم آنی چاہیئے۔ میں ان کی فکریں گھٹاتا نہیں، بڑھاتا ہوں۔ نہ میرا کوئی کام ہے نہ میں کما کر لاتا ہوں۔ پھر میرا اس گھر میں کیا مقام ہے سرور؟ میں یہاں سے کہیں اور کیوں نہ چلا جاؤں؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟" سرور نے خوفزدہ ہو کر اسے جھنجھوڑ ڈالا "کیا مار ڈالو گے بھائی جان کو۔ واہ جی! یہ اچھی محبت ہے۔۔ شراب پی کے تو نہیں بیٹھے تھے تم؟"

"یہی ایک راستہ ہے بس"

"عبیر!" سرور نے بے حد پیار سے چمکار کر کہا

"کیا ہے؟" اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ایک بات کہوں۔ مان لوگے بھلا؟"

"کہو!" اس نے جھنجھلا کر کہا "ذرا میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"نہیں یوں نہیں۔ پہلے تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھاؤ۔ میں جو کہوں مان لوگے"

"فضول بکواس مت کرو" اس نے گریبان سے پکڑ کر سرور کو الگ ہٹایا اور کمرے سے نکلا چلا گیا۔ سرور دو لمحے تو بھونچکا سی کھڑی رہی پھر اس کے پیچھے دوڑی اور کمر تھام کر ڈٹ گئی۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ دس ہی منٹ

میں اس کی ذہنی رو کہیں اور بھٹک گئی تھی۔ ایک قہقہہ لگا کر سریر سے بولا
"ارے کیوں گھگھیاں کر رہی ہے سریر کی بچی"
"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اسے زیادہ مضبوطی سے جکڑ لیا۔
"توقیر کے پاس"
"میری قسم کھاؤ" سریر روہانسی ہو کر بولی۔ جواب میں جبیر نے ہانک لگائی "ارے بھئی ممی! اس مصیبت کو بلائیے اپنے پاس۔ دیکھئے مجھے جانے نہیں دیتی"
"مجھے بھی لے چلو"
"بجا تجھے اٹھا کر پٹخ دوں گا سریرا! چاہے کچھ بھی تیرا حشر ہو۔ چھوڑ دے مجھے"
سریر نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر ہونک بن کر ننھی سی بچی کی طرح رونے لگی۔ جبیر سر تھام کر بیٹھ گیا۔
"بول بابا! کیا چاہتی ہے؟" اس نے جیب سے پرس نکالا۔ "کتنے پیسے؟"
"پیسے ویسے مجھے نہیں چاہئیں" سریر بسورتی ہوئی بولی۔
"تو پھر کیا؟" جبیر نے جھنجھلا کر پوچھا۔
"تم جاؤ جہاں جا رہے تھے۔ تمہیں مجھ سے کیا کام؟ کیا واسطہ؟
مجھ ایسی جنگلی بلی کو بسورتی چھوڑ کر کیسے جاؤں؟
سچ مچ تم اتنا خیال کرتے ہو میرا؟"
"ہاں بھائی"
"تو پھر اندر چلو" سریر خوش ہو کر بولی "کھیلیں گے لڈو"
بن سنور

"سریہ یہ تمھاری بدمعاشیاں اچھی نہیں ہیں" جبیر نے کہا مگر اس کے ساتھ اندر کی جانب قدم بڑھا دیے "تم جب مجھے اس طرح زچ کرو گی تو میں واقعی گھر سے چلا جاؤں گا"

"کون تمھارا سگا گھر سے باہر بیٹھا مر رہا ہے تمھارے فراق میں" سریہ حلق پھاڑ کر بولی "جب دیکھو تب دھمکاتے ہیں۔ گھر سے چلا جاؤں گا۔ گھر سے چلا جاؤں گا۔ کیا کوئی نئے اماں، بابا، بہن، بھائی، بیوی، بچے گھر سے باہر پیدا کر کے رکھے ہیں۔ جن کے پاس جاؤ گے"

جبیر تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں آیا اور بے جان سا دیوان پر گر گیا۔ پھر بے بسی سے سریہ کو دیکھتا ہوا بولا "اس دنیا میں کہیں میرا جی نہیں لگتا۔ بیٹی"

"میرے معزز بزرگ باپ۔ آپ دنیا سے باہر بھی تو نہیں جا سکتے۔ آپ جہاں جائیے گا یہی زمین ملے گی۔ یہی آسمان ملے گا۔ مگر یہی لوگ جو آپ پر جان چھڑکتے ہیں، نہیں ملیں گے تو پھر یہ کیوں نہ کیجیے کہ اسی دنیا میں، اسی گھر میں اپنے لوگوں میں رہ کر دل لگانے کی کوشش فرمائیے"

"بہت کوشش کرتا ہوں"

"خاک نہیں کرتے۔ دل تو تب لگے گا جب تم اس طرف توجہ کرو گے"

"کیسے کروں گا توجہ"

"علاج کر کے"

"لاحول ولا قوۃ"

"پھر شیطان کو بھگانے لگے" وہ منہ بنا کر کہا۔

"... [illegible] شاید بھاگ جائے۔ مگر تم نہیں بھاگو گی۔ تم [illegible] سے زیادہ گندی ہو تم"

جبیر نے بے ساختہ جھنجھلا کر کہا اور سریہ کے گال پر چھوٹا سا تھپڑ لگا [illegible]

"کوئی وجہ تو ہوگی؟" انھوں نے پُرخیال لہجے میں پوچھا۔

"وجہ دیکھا ہے جناب... جو میں نے راستے میں آتے آتے آپ سے بیان کی تھی۔" ایکی دانش نے جواب دیا۔

"عجیب وجہ ہے۔" انھوں نے ایک آنکھ بند کرکے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "شور و غل، سنگیت، بارات اور پھر ظلمت۔ سمجھ میں نہیں آتا... خیر۔ اگر اسی وجہ کو بنیاد تسلیم کرلیا جائے تو پھر بارات کے ایک ہجوم کا انتظام کرنا پڑے گا... جو ان کے سامنے سے گزرے اور انھیں سب کچھ یاد کرنے کے لیے پچھلے کسی نقطۂ آغاز تک لے جاسکے۔"

"آپ کا طریقۂ علاج سمجھ میں تو آتا ہے مگر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔" کرنل صاحب نے کہا۔

"اس کے علاوہ جناب۔ کیا ان پانچ برسوں میں بارات کا ایک جلوس بھی جنیر صاحب نے نہیں دیکھا ہوگا؟" دانش نے خفیف سا مسکراکر کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں اس برآمدے کے نیچے والی شاہراہ سے سیکڑوں باراتیں اس عرصے میں گزر چکی ہوں گی۔"

"جی ہاں... ابھی ایک ہفتہ پہلے ایک بہت شاندار بارات بڑی دھوم دھام سے گزر چکی ہے۔" کرنل صاحب نے جواب دیا۔ "میں تو خوش ہوا تھا کہ شاید وہ اسے دیکھ کر کچھ یاد کرسکیں۔ مگر۔"

مگر؟" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کچھ نہیں" کرنل صاحب نے کہا "انھوں نے بڑے غیر جذباتی طریقے سے بارات دیکھی۔ بلکہ یوں کہ [illegible] وہ سمجھ ہی نہیں [illegible] اچانک کمرے میں چلے گئے۔"

مشکل کام ہے [illegible] دانش کچھ بیزار سے نظر آنے لگے۔ کرنل صاحب
کے چہرے پر بھی اکتاہٹ کے آثار منڈلانے لگے۔ مگر ڈاکٹر صاحب چپک گئے اور اس
کی پچھلی ساری ہسٹری زبردستی پوچھ لیتے تھے۔ حتیٰ کہ دانش صاحب اجازت لے کر
چلے گئے۔ پھر اچھی طرح کرنل صاحب کا دماغ خالی کر کے وہ حضرت سدھارے تب
کرنل صاحب گھر میں آئے۔

"عبیر کہاں ہیں بیٹی!" کرنل صاحب نے پوچھا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب کیسے احمق تھے بھائی جان۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کچھ آتا
جاتا نہیں۔ عبیر تو بے حد غصّے میں تھے۔ ابھی سامنے والی نہر کی طرف گئے ہیں۔
کہتے تھے کہ دماغ کو تازہ ہوا پہنچا لوں تو واپس آؤں۔"

"بلا لاؤ بیٹی۔ ان کا اکیلے اس طرح جانا مناسب نہیں ہے۔" کرنل صاحب
نے کہا۔

سریر نے بھی سوچا پاگل آدمی کا کیا بھروسہ۔ لگا دے چھلانگ پانی میں۔
نہر کی طرف دوڑنے لگی۔ دور ہی سے اسے عبیر نظر آیا۔ نہر کے کنارے چھوٹے سے
سرسبز ٹیکرے پر بیٹھا تھا۔ پس منظر میں پھیلی ہوئی سرخ و زرد شفق کی تیز
چمکیلی روشنی میں اس کا بھاری بھرکم ہیولیٰ سیاہ اور بخوبی واضح ہو رہا تھا۔
سریر پنجوں کے بل چل رہی تھی۔ ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ پھر اپنی دبے پاؤں
نزدیک پہنچ کر اس نے اچانک اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ عبیر یکبارگی
چونک پڑا اور سریر کا قہقہہ آزاد ہو گیا۔ اسے گدگدا کر بولی "ڈر گئے۔ بڑے
رستم بنتے تھے۔"

عبیر کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔ وہ بدستور اپنے پیروں کے قریب سے ننھی منی
کنکریاں اٹھا کر پانی میں پھینکتا رہا۔ پھر ایک سرسری نگاہ سریر پر ڈال کر بولا

بیٹھ گئے۔ ظہیر کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ باہر کے برآمدے میں بیٹھ کر سریہ کو تکنے لگا۔

"یہی بات تو بھائی صاحب بھی کہہ رہے تھے۔" ظہیر نے کہا "وہ کہتے ہیں کہ تم نہایت نکمی اور نکھٹو لڑکی ہو۔ ابھی تک کوئی اچھی سی لڑکی ظہیر کے لیے نہ ڈھونڈ سکیں۔ چلاتی بہت ہو۔"

"میرا کیا ڈھونڈھنا" سریہ تنک کر بولی "ان کے لیے تو اپنی مدحت پہلے سے —"

"مدحت!—" ظہیر نے آہستہ سے دہرایا۔ اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"اس بچی کا نام نہ لیا کرو ان کے سامنے۔ بی بی" نگینہ بیگم نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "وہ تو قصہ ہی ختم ہو گیا... دانش میاں نے تبھی جواب دے دیا تھا۔ لکھا تھا اپنے خط میں کہ ایک پاگل سے وہ اپنی بہن ہرگز نہیں بیاہ سکتے۔"

"ہائے بھابھی امی۔ کب لکھا ایسا خط دانش صاحب نے؟" سریہ بھنا گئی "مگر وہ تو ڈاکٹر کو لے کے آئے تھے۔ اتنی ہمدردی کرتے ہیں اپنے اچھے"

"اپنی سونے کی چھری ہے تنگ ہے مگر اس قابل نہیں کہ کوئی اسے پیٹ میں مار لے" بہت ناگوار اور تلخ لہجے میں سعادت جہاں نے کہا۔

"پھر اس تذکرے کو یہیں ختم کر دو" کرنل صاحب نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ ظہیر کے کان میں بات پڑ جائے — ان کی تقدیر میں اگر کوئی لڑکی ہو گی تو خود بخود مل جائے گی ورنہ ہمیشہ کے لیے صبر کر لیں گے۔ مگر مدحت کا نام نہیں لیں گے۔"

"بھائی جان! وہ کتنی پیاری بچی ہے" سریہ نے کہا "بالکل اپنے بھیا کے قابل... کیا لکھا تھا دانش صاحب نے خط میں؟"

مگر کرنل صاحب نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

توقیر کی شادی کا دن آپہنچا۔ ایک تو اس کی امی بہت زیادہ دلگیر تھیں۔ اور دوسرے شباہت جبیر کی افتادِ طبع سے خائف تھا۔ لہٰذا اس شادی میں بالکل دھوم دھام نہیں تھی۔ ایک خاموش چہل پہل ضرور تھی۔ مہمان آرہے تھے۔ روشنیاں جگہ جگہ تھیں۔ گھر میں اور گھر کے باہر کافی شور و غل تھا مگر ایسا ہنگامہ نہیں جو شادیوں کا خاصہ ہے۔

ابھی توقیر کی سہیلیاں نہیں آئی تھیں۔ صرف ملاحت اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور توقیر آنسو بہا رہی تھی۔ اپنے زرد لباس میں ملبوس وہ مرجھائی ہوئی چمپے کی کلی معلوم ہو رہی تھی۔

"یہ تو ہر لڑکی کا نصیبہ ہے۔ ملو!" اس نے ایک جانگسل سی سانس لے کر کہا "اگر اس طرح نصیب نہ جاگے تو پھر ساری دنیا بدنصیبی کا تمغہ پہنا دیتی ہے ... مجھے صرف ایک غم ہے۔ میری امی ہمیشہ کے لیے جا رہی ہیں۔ اگر میری تقدیر نے مجھے کبھی آنسو بہانے پر مجبور کیا تو کون سی ماں کا شفیق آنچل میرے آنسو پونچھنے کو بڑھے گا؟"

"تجھے نہ بھولیں گی توقیر!" ملاحت نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تو ہمیشہ سے تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔ تم اس طرح روؤ گی تو خالہ جی کا سفر کھوٹا ہوگا۔ وہ یہاں سے مطمئن روانہ نہیں ہوں گی۔ ایسے مقدس سفر کے لیے جانے والے کے دل میں خلوص نہیں ہوگا۔ ان کا سارا دل تم میں لگا رہے گا۔ تم ان کا حوصلہ بڑھاؤ توقیر۔ اب تو یہی تمھارا فرض ہے۔" اس نے اتنی دل نشیں باتیں کیں کہ توقیر اپنے مستقبل پر قانع ہوگئی۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے دوران میں ملاحت نے چپکے سے توقیر کے کان میں کچھ کہا۔ وہ وقت

نہیں ہوتے کہ ہمیشہ اسے پکارا کیجئے۔"

"کیسا انتظام؟" اس نے خالی الذہنی کے انداز میں پوچھا۔ توقیر نے بات
کہنے کے بعد غور کیا کہ اس سے رمز و کنایہ میں گفتگو کرنا بیکار ہے... وہ چپ ہو گئی۔
پھر آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ پھر توقیر نے خیال کیا کہ شاید وہ کوئی بات
مدحت سے کرنا چاہتا ہے جو اس کی موجودگی میں نہیں کر سکتا۔ اپنی نشست پر
پہلو بدلنے لگی پھر کھسیا کر ہنستی ہوئی بولی "میں آپ کے لیے چائے لے آؤں۔
جبیر بھائی۔"

"ضرور لے آؤ" جبیر نے کہا۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ اس طرح
توقیر دونوں کو تنہا کرنا چاہتی تھی۔ مدحت نے توقیر کو روکنا چاہا مگر وہ اٹھی اور
چلی گئی۔ جبیر نے سگریٹ دروازے سے باہر پھینکا اور مدحت کے پاس آ کھڑا ہوا۔
اس نے ملتجی لہجے میں پوچھا "تو کیا تمھیں اس بات کا پتہ ہے کہ ہمارے یہاں
سے تمھارے یہاں کوئی پیغام گیا ہے؟.... مجھ سے شرماؤ نہیں... مجھے جواب
دو۔ پھر ہو سکتا ہے کہ میں تم سے مل نہ سکوں اور پھر الجھن کی طرح تمھارا جواب
بھی الجھن بن کر رہ جائے۔"

"جی" مدحت نے سر جھکا کر جواب دیا اور لگاتار ان قدموں کو دیکھنے لگی جو
اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ پر خوف کا کہرا چھانے
لگا وہ اس کی محبت کے باوصف اس کے پاگل پن سے بہت ڈرتی تھی۔
"تو مدحت کل رات کو چند باتیں میں نے سنی تھیں۔ مگر وہ ایسی مبہم تھیں کہ
میں ان کا حل نہیں سوچ سکا" اس نے کہا "کیا یہ صحیح ہے کہ میرا پیام بیرسٹر
صاحب کو دیا گیا تھا جو انھوں نے مسترد کر دیا؟"
مدحت کو سب پتہ تھا۔ مگر وہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ڈرتی تھی۔

معلوم نہیں کہ جبیر کا کیسا ردِ عمل ہو؟ کیا کرے وہ۔ اس نے اپنے دل میں امنڈتے والے طوفان کو دبلتے ہوئے جھوٹ بولا "! مجھے کہاں معلوم ہوتی ہیں ایسی باتیں۔"

"اگر معلوم ہو جائے گا تو تم کیا کرو گی۔ وحت، ؟ کیا تم کسی سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟"

"ہاں" اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "جب میں آپ ہی آپ گھٹتے پگھلتے اور جلتے ختم ہو جاؤں گی تو سب کو پتہ چل جائے گا کہ میرا دل کیا چاہتا تھا"

"کوئی تدبیر اور سوچو۔ زبان سے موت کی آغوش میں پہنچنا بہت آسان ہے مگر حقیقت میں گھلتے گھلتے پگھلتے اور جلتے مرجانا اور بات..... جبیر نے لبالب اندر وحت کا چہرہ تھام کر اپنی طرف پھیرا۔ وحت کے دل کی رگیں کھنچنے لگیں۔ اس کے گرم ہاتھوں کے لمس نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ جبیر اس کے چہرے پر جھکا اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہیں دور دیکھ رہا ہو۔

"تمہارے چہرے میں کس کا چہرہ پوشیدہ ہے؟ میں نے پہلے پہل تمہیں کہاں دیکھا تھا۔ اف۔ کہیں پھر میں پاگل نہ ہو جاؤں"

وحت نے گھبرا کر اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔ دل کی دھڑکن تیز تھی کہ قابو سے باہر شادی کا گھر تھا۔ نہ جانے کون کون سے اپنے اور پرائے تھے۔ کسی غیر نے اگر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ وہ گم صم سوچے جا رہی تھی۔ اور جبیر نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔ وحت نے چاہا کہ ایک دم سے بھاگ پڑے۔ پھر خیال آیا کہ اگر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ تب؟ — وہ دعا مانگنے لگی کہ خدا تو قبر کو بھیج دے۔ پر وہ نہ آئی۔

"آہ.... میں نے تمہیں بہت چاہا... وحت... روح کہ دو جسم کی

اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

کیک کی ٹرے اس کے سامنے لا رکھی۔ اس نے جلدی جلدی دو ایک کیک اور
پائیاں کھائیں۔ چائے پی۔ پھر لباس بدلا اور پیسوں کی تلاش میں کرنل صاحب
کی الماری کھولی۔ اس میں رقم تو نہیں ملی۔ البتہ ملبوسات کی تہہ برابر کرتے
ہوئے ایک آدھ کپڑا نیچے گر گیا۔ تہہ کھلی اور کوئی خط اس سے نکل کر فرش
پر گر پڑا۔ اس نے سب کچھ سمیٹا اور الماری میں رکھ رہا تھا کہ خط میں اپنا نام
دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ دل نہ مانا۔ لفافہ الگ پھینکا اور رائٹنگ چیئر پر بیٹھ کر
پڑھنے لگا۔ جوں جوں نظریں سطروں پر پھیلتی رہیں۔ چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔
پھر خط میز پر پھینک دیا اور ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ کر بلبلا اٹھا۔ دماغ میں
آندھیاں سی چل رہی تھیں اور ذہن میں ایسا شور برپا تھا جیسے سیکڑوں روحیں
آس پاس چکر لگا رہی ہوں۔

"تقدیر۔ تقدیر۔" اس نے سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک دیا اور
آنکھیں بند کر لیں۔ گھر بھر میں سناٹا تھا۔ شاید کچن میں ملازموں نے ٹرانسسٹر
آن کر دیا تھا۔ شمشاد بیگم کی آواز سناٹے میں دل کو برما رہی تھی ؎

اک تیرا سہارا۔ اک تیرا سہارا۔
دل توڑ کے دنیا نے کیا ہم سے کنارہ۔ اک تیرا سہارا۔
شکوہ ہے کسی کا نہ شکایت ہے کسی سے
فریاد ہے اک ٹوٹے ہوئے دل کی کجی سے
ہوتا نہیں برباد کوئی اپنی خوشی سے۔ بیدرد زمانے میں نہیں کوئی ہمارا۔
اک تیرا سہارا۔

[illegible]
[illegible]

"بھاگ جاؤ!" وہ دہاڑا۔ ملازم چوکھٹ ہی سے واپس چلا گیا۔

شباہت کو اس کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کے گھر میں مہمانوں کا ہجوم تھا ست دولہا بنانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ مگر وہ سب سے الگ تھلگ ٹہل رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کی نظریں گیٹ کی طرف اٹھتیں۔ جہاں سے مسلسل کاریں اور دوسری سواریاں آ رہی تھیں۔ مگر کرنل صاحب کی رولز کا پتہ نہیں تھا۔

اس نے کسی سے کہہ کر سریر کو بلایا اور ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا" ظہیر کو آج تاریخ کا پتہ تھا سریر؟"

"ہاں۔ شبو بھیا وہ تو کل ہی سے انتظامات میں لگے تھے۔" سریر بولی " ممکن ہے کچھ اور خریدنے لگے ہوں۔"

"تمہارے آتے وقت وہ کہاں تھے؟"

"مجھے پتہ نہیں میں تو صبح ہی سے منو کے یہاں تھی۔ اب آپ کی بارات میں شامل ہونے کے لیے تھوڑی دیر پہلے یہاں آئی ہوں۔"

"سریرا مجھے اب وحشت ہو چلی ہے۔ کتنے ٹیلیفون میں نے کیے۔ آخر وہ کہاں رہ گئے؟" شباہت نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر نیچے اُتر۔ اسے دیکھ کر ظہیر چونک پڑے۔

"تم کہاں بھاگے جا رہے ہو اس طرح؟"

"ظہیر ابھی تک نہیں آئے...؟" شباہت نے کہا۔ اس کے لہجے سے بیقراری مترشح تھی۔ "صرف ایک مرتبہ انھوں نے میری کال کا جواب دیا۔ دوسری کال نوکر نے وصول کی۔ کیا معاملہ ہے؟"

"ممکن ہے نہ بھی آئیں۔" ظہیر نے غیر اہم لہجے میں کہا" شادی کی محفلوں سے وہ

"عبیر ابھی تیار نہیں ہوئے چچا جان! بس انھیں لے کر آ ہی رہا ہوں"

"وہ ہر طرح اچھے تو ہیں؟"

"جی ہاں۔ بالکل"

"اچھا بیٹے جلدی پہنچو!"

ریسیور اسٹینڈ پر پھینک کر وہ پھر کمرے میں آیا اور جھک کر عبیر سے کہا "اب تو چلو عبیر! چچا جان وہاں تمھارا انتظار کر رہے ہیں"

اس نے نفی میں ہاتھ ہلا دیا۔

"تمھارے بغیر یہ شادی غمی میں بدل جائے گی۔ عبیر! میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں، پاؤں پڑتا ہوں۔ میرا کہا نہ ٹالو۔ تمھیں نے مجھے مجبور کیا تھا۔ ورنہ میں کب راضی تھا اس شادی پر۔ تم اگر نہیں چلو گے تو میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔ مجھے خدا کی قسم اس شادی کی رتی بھر خوشی نہیں۔

"تم نے پڑھا شباہت!... اس تحریر نے میرے خوابوں کی دنیا کو درہم برہم کر دیا ہے۔ میں بدنصیب اسی امید پر جی رہا تھا۔ اب زندگی گزارنے کا کون سا بہانہ ہے؟ تقدیر نے امید کا سنہرا خواب دکھا کر مجھے نا امیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کیوں پھینک دیا... کیوں میری قسمت میری دشمن بن گئی ہے؟ کیوں میرا خالق نہیں چاہتا کہ مجھے دنیا کی ذرا سی بھی خوشی میسر آسکے؟ کس نے مجھے پاگل کر دیا۔ کیوں میں پاگل بن گیا؟ کون مجھے جواب دے سکتا ہے؟ آہ! کوئی نہیں۔ اف... بے درد نامہربان تقدیر۔ اگر تو مجسم ہو کر میرے سامنے آتی تو خدا کی قسم میں تیرے پرخچے اڑا دیتا۔ نہ تو ظالم مجھ سے وابستہ ہوتی نہ میں تیرے دکھ سہتا۔ میں اب کیا کروں؟ کیا کروں؟؟"

"اتنا حوصلہ نہ ہارو عبیر! خدا کے خزانے میں بہت سی خوشیاں تمھارے

لیے ہیں۔ کسے معلوم ہے کہ وہ تمھیں کب ملیں گی نا امید نہ ہو اللہ کارساز مطلق ہے۔ ہم کو تم کو خبر نہیں۔ وہ ہمارے لیے کیا سوچ رہا ہے۔"

"دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ شباہت... مجنوں کی سی... جو انسان جانتا ہو کہ اللہ اس کے لیے کیا سوچ رہا ہے۔ وہ ان خوش کن تسلیوں سے مطمئن ہونے والا نہیں۔ بربادی، تباہی، حرماں نصیبی۔ اس کے سوا اور کیا سوچے گا خدا میرے لیے" اس نے نہایت تلخ انداز میں ہنس کر کہا۔

"یوں نہ کہو جنید! شباہت بے چارہ بولا۔ دیر تک وہ اسے سمجھاتا رہا مگر جنید ٹس سے مس نہ ہوا۔

"اف! میرے خدا!! میں کیا کروں؟ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"تم جاؤ شباہت! تمھیں دیر ہو رہی ہے۔ کچھ نہ سوچو۔ یہ تو میری تباہی تھی"

"تم نہیں جاؤ گے؟" شباہت نے بڑے مردہ لہجے میں پوچھا۔

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو شباہت! میں کیسے جاؤں؟ وہاں بیرسٹر صاحب ہوں گے، ڈیڈی ہوں گے اور مجھے یہ سوچ کر غصہ آ جائے گا کہ انھوں نے الٹا ہی کیا جواب دیا تھا۔ میں ان کے سامنے جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کل نذیر سے ملوں گا۔ اسے پیار کروں گا۔ اپنے سینے سے لگاؤں گا۔ میں نے اسی سے وعدہ کیا ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا... مگر مجھے اس وقت معاف کر دو"

"تو نذیر ہی کے گھر چلو۔ میرے یہاں مت چلو"

"وہاں ملامت ہوگی۔ اور یہ سوچ کر شاید میں دیوانہ ہو جاؤں گا کہ راحت اب مجھے کبھی نہیں مل سکتی"

"میرا دل خود جانا چاہتا جانے کو۔ بے حیائی کی انتہا ہے کہ یہاں اندھیرا۔

نہیں بیٹے تم تو اتنے بیمار ہو اور میں بے پروا ہو کر بارات لے جاؤں....
کیا مجھ سے چلا جائے گا۔ نہیں ہرگز نہیں... میں ابھی امی کو فون کر کے
صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ جب خالہ امی حج سے واپس آئیں گی۔
تب دیکھا جائے گا۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو" شبیر نے کہا "دونوں جگہ تیاریاں ہو چکی ہیں، مہمان آ چکے ہیں، بارات کے جانے کی بس دیر ہے۔ تم لڑکی کی پوزیشن سے واقف نہیں۔ لوگ چہ میگوئیاں کریں گے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت جانا ہے شباہت! میری فکر نہ کرو۔"

"شبیر! فکر ہی، غم، تنہائی میں تمہیں چھوڑتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔"

"بہت ڈرپوک ہو گئے ہو" شبیر مسکرانے لگا "میں کچھ نہیں سوچوں گا۔ تمہارے جانے کے بعد کچھ دیر تلاوت کروں گا پھر نماز پڑھوں گا اور دعا مانگوں گا کہ وہ خدا جس پر تمہارا ایمان ہے کم از کم تمہیں تو وہ سب دیدے جو اس نے مجھے نہیں دیا۔۔۔ جاؤ خدا حافظ و ناصر!"

شباہت ایک دم سے دوڑ کر زار زار اس سے لپٹ گیا۔ شبیر نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

پھر جب تک شباہت کی گاڑی اسے نظر آتی رہی وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر وہ اندر آیا اور اپنے خانساماں، ہیڈ بیل بائے اور ڈرائیور کو اطلاع دی کہ شباہت کی شادی ہے۔ لہٰذا جتنے ساز اور سازندے اس وقت موجود ہوں وہ سب دلہن سے پہلے پہنچ جائیں۔ پھر اس نے ٹیکسی کو فون کر کے ہدایت دی کہ جتنی زیادہ روشنی کا [illegible] فوراً بارات کے لیے کرایا جائے۔
اور دلہن [illegible] بے شمار باجے اور ان گنت رنگ

تھیں۔ در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ ماں سینے پر صبر کی سل رکھے بیٹی کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

پھر شباہت اندر آیا۔ وہ بے حد اداس تھا۔ اس نے جھک کر توقیر کی امّی کو سلام کیا اور پھر ان کے قدموں میں جھک گیا۔ اس کے سارے بار پھول، اس کا گھنا گھنا سہرا، ان کے قدموں میں آ رہا۔

"جگ جگ جیو میرے بیٹے!" امّی نے بڑی مشکل سے آواز ابھار کر کہا۔ "آج میں نے اپنی نازوں کی پالی بچّی تمھارے حوالے کر دی۔ شباہت بیٹا! وہ یتیم ہے، دکھی ہے، بے زبان ہے... آج کے بعد میں بھی اس سے جدا ہو رہی ہوں اس لاوارث کے وارث اس کا سہارا اس کے سب کچھ تمہیں ہو بیٹا! یہ سوچ کر اسے کوئی دکھ نہ پہنچنے دینا کہ اس کا باپ ہے نہ ماں" ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

شباہت بھی رو رہا تھا۔ ماں کے آنسو خیر و برکت کے پھولوں کی طرح اس کے سر پر گر رہے تھے۔

"جاؤ بیٹی! اپنے گھر سدھارو" انھوں نے توقیر کو دعا دی، اور جب شباہت نے اس کا ہاتھ تھاما وہ آنچل سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

باہر اس کار کا ہارن گونجا جو شبیر کے تحفے کے طور پر توقیر کو دی گئی تھی۔

اچانک ناشپال چھوٹنے لگے۔ باجوں کا ترانہ نرالا ہو گیا۔

بڑی دھوم دھام سے بارات دلھن کو لے کر چلی۔

واپسی پر شباہت دلھن سے زیادہ آنسو بہا رہا تھا۔ یہ کون سمجھتا کہ اسے اپنا پیارا دوست بہت یاد آ رہا تھا۔

جب سب چلے گئے۔ تب وحشت واپس دلھن کے کمرے میں گئی۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں، کمرہ منتظر ہوا میں آہٹ بکھر رہی تھی۔ بکھرے پھولوں کی

کچھ جانتا نہ جاننا سب برابر تھا۔

اس پر آہستہ آہستہ غصّہ دھند کی طرح چھانے لگا۔

"یہ ڈیڈی..." اُس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا "کیا خوب!... اتنی شدّت سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے کبھی نہیں بتایا کہ جنہیں انھیں دانشمندوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہے کہ تُو پاگل ہے۔ اور ممّی — واہ جناب... سینے سے چمٹا کر آنسو بہانا اور بات ہے، کسی کے لیے فلاح کا سامان مہیّا کرنا اور بات......

آہا! یہ میرے ماں باپ ہیں... ماں باپ..."

وہ رفتہ رفتہ اسے اتنی شدّت کا غصّہ آیا کہ اس نے درمیانی تپائی کو جو زبردست ٹھوکر لگائی تو وہ سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی، ایش ٹرے فرش پر گرا۔ آواز سُن کر اس نے آہنی ایش ٹرے اٹھالیا اور یوں دروازے پہ دے مارا کہ وہ چکنا چور ہوگیا۔ پھر اس کی خون برساتی آنکھیں کرنل صاحب کے وجیہ و پُر رعب پورٹریٹ پر رک گئیں۔ وہ پورٹریٹ کے نیچے آکر کھڑا ہوگیا۔

اب تو ہانپ رہا تھا۔ لوہار کی دھونکنی کی طرح سینہ ابھر اور ڈوب رہا تھا۔ مٹھیاں کس کر اس نے پوچھا: "کون ہو تم؟— یہ کس کا چہرہ ہے؟ یہ کہاں سے آیا ہے؟ یہ شکل میں نے کہاں دیکھی تھی؟... یہ مدحت ہے... مدحت —؟ اس نے بلند آواز میں پکارا۔

"یہ کس کا نام ہے؟" اس نے گھوم کر کسی سے پوچھا "یہ میرے ذہن میں کیوں تہلکہ مچا رہا ہے؟ یہ نام کس کا ہے؟ مجھے کیوں یاد آرہا ہے؟ اے! تم سامنے آؤ!!"

کمرے میں اس کی آواز گونج کر معدوم ہوگئی۔ پھر وہ دریچے میں آکھڑا ہوا۔

"مجھے لوگ بیکار سمجھتے ہیں۔

"فضول سا انسان۔ کھانا پینا اور زندہ رہنا بھی کوئی کام ہے؟ پھر وہ اپنی

زندگی کی بوجھل لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے کیوں پھر رہا ہے؟

کیوں؟

کیوں؟

"یہ چھوٹی بھٹکی زندگی!

"لوگ اس پر ترس کھاتے ہیں۔ درحقیقت، وہ چند ہمدردوں کے رحم و کرم پر جی رہا ہے، دوسروں کی توجہ کا محتاج ہے۔ اگر وہ اس کی خبر گیری اور چارہ گری سے ہاتھ اٹھالیں تو وہ شاید مر جائے!"

اس نے جیب میں پڑا سگریٹ کیس مٹھی میں دبوچ لیا۔

"نہیں!" اٹھ کر اور چنگھاڑ کر اس نے کہا "مجھے نہیں چاہیے ایسی زندگی! یہ بھیک ہے، زندگی کی بھیک! میں ختم کر دوں گا اسے۔ جن لوگوں نے مجھے بھیک سمجھا ہے وہ چار آنسو تو بہائیں میرے جنازے پر۔ یہی ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔"

وہ فاتحانہ انداز میں ہنسا، دروازہ کھول کر دیکھا۔ چہار اور گرد ناچ رہی تھی۔ ایک مرتبہ مڑ کر اپنے کمرے کو دیکھا اور گھر سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

کرنل صاحب ایزی چیئر پر لیٹے لیٹے سو گئے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو آنکھ کھلی۔ رات ہو چکی تھی۔ اداسی سی ان کے دل پر چھائی ہوئی تھی۔ بیماروں کی طرح تھکے تھکے انداز میں کمر جھکائے ہوئے برآمدے تک آئے اور بےدلی سے ریسیور اٹھایا۔ شجاہت اپنے گھر پہنچ کر انہیں مخاطب کر رہا تھا۔

"چچا جان! میں آ رہا ہوں۔ عبیر سے کہیئے کہ اس وقت کہیں سو نہ جائے۔ وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"اپنے کمرے میں بیٹھے کلام مجید پڑھ رہے ہیں... ان سے کہہ دوں؟"

پہنچی اور نیم جان ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔

"شبو بھیا! ابّن کو ڈھونڈھیے" سریرا اس کے آگے کھڑی رو رہی تھی۔ اس نے سریرا کے کندھے پر چپکے سے تھپکی دی اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"ڈھونڈھیں گے سریرا! ساری رات..." کرنل صاحب کی آواز گھٹ گئی۔

"شاید پھر بہک گئے!" سطوت جہاں نے کہا۔

ثمینہ بیگم کی یہ حالت تھی جیسے کہ دفعتہً ان کی جان نکل گئی ہو۔ جیسی بیٹھی تھیں، بیٹھی رہیں۔ نہ آہ، نہ واہ، نہ کچھ بات چیت۔ آہستہ آہستہ ان کا دل ڈوب رہا تھا پھر وہ تخت پر پائنتی لڑھک کر بے ہوش ہو گئیں۔

"خدا رحم کرے....!" ظہیر کے منہ سے نکلا۔ انھوں نے ثمینہ بیگم کو آوازیں دیں۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ کرنل صاحب اپنی جگہ سے نہیں ہلے بلکہ نہایت سرد آواز میں کہا "یہی ٹھیک ہے ظہیر میاں۔ یہ ادھر اسی طرح ختم ہوں، ادھر وہ بدقسمت مر جائے۔ میں خود بخود جہنم واصل ہو جاؤں گا۔ یہ سیہ بخت تثلیث اس طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے۔"

سریرا دہشت زدہ ہو کر بلند آواز میں رونے لگی۔ سطوت جہاں نے ثمینہ بیگم کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے شروع کیے۔ ظہیر نے پنکھا چلا دیا۔ بارے خدا خدا کر کے انھیں ہوش آیا۔

"ہم ظہیر کی تلاش میں جا رہے ہیں چچی امّی!" شباہت ان پر جھک کر بولا، "آپ خود کو سنبھالیے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے۔ آپ حوصلہ رکھیے۔ اس طرح تو پریشانی بڑھ جائے گی۔"

"دل [illegible] نہیں ہے، طاقت برداشت کی نہیں رہی یا اللہ! تو مجھے دنیا سے اٹھا کیوں [illegible]....." بے چاری بڑے درد سے رونے لگیں۔

"آیئے ظہیر بھائی! چلیں۔ جتنی دیر ہوتی جائے گی، ظہیر میں اور ہم میں اتنا ہی فاصلہ بڑھتا جائے گا۔" شباہت نے کہا "چچا جان! آپ تکلیف نہ کیجیے۔ ہم دو آدمی کافی ہیں۔"

"اچھا بیٹے! جیسا مناسب سمجھو وہ کرو۔" کرنل صاحب کی ہمت بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔

"چلیے ظہیر بھائی!" شباہت نے کہا۔ ظہیر بے حد تھکے ہوئے تھے مگر وہ کچھ نہ بولے۔ اسٹینڈ سے کرنل صاحب کا مفلر کھینچا اور کانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے چپ چاپ شباہت کے ساتھ چلے گئے۔

گھر سے بڑی دور اندھیرے میں ڈوبی سڑک پر خستہ حال و پریشان جبیر لڑکھڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اسے احساس نہیں تھا کہ یہ راستہ کلب کی سمت جاتا ہے۔ مگر اس کے قدم خود بخود جس راہ پر اٹھ گئے وہ اسی پر ہو لیا۔ راستے میں وہ تیز رفتار موٹروں کی زد میں آتے آتے بچا۔ سائیکلوں سے ٹکریں کھائیں، لوگوں کے دھکے لگے۔ مگر وہ اپنے غصے کی آندھی میں اڑا جا رہا تھا۔

کلب کے پورچ ہی میں اسے وہاں کا منیجر مسٹر اسٹیفن مل گیا اور بے حد گرمجوشی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔

"ہیلو۔ مسٹر جبیر! آپ بڑے وقت پر پہنچے۔ اس وقت ایک آئٹم رہ گیا تھا۔ اسے آپ کو سنبھالنا ہے۔۔۔۔ آئیے اندر چلیے۔ ہاں۔ آپ کیا پئیں گے؟"

"زہر" وہ دفعتاً یوں چیخا کہ منیجر کا بڑھا ہوا ہاتھ سمٹ گیا اور وہ جبیر کو گھورنے لگا۔

"میں کہتا ہوں میرے لیے زہر لاؤ۔ زہر۔۔۔۔" وہ یوں چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

"مسٹر جبیر! کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" منیجر نے پوچھا۔ کئی آدمی ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ وہ سب جبیر کو جانتے تھے۔ وہ بھی اس وقت متحیرانہ انداز میں جبیر

کو دیکھ رہے تھے۔

منیجر نے ایک بار گہری نگاہوں سے عبیر کا جائزہ لیا۔ اسے یقیناً ہی دوسرا نظر آیا۔ اس کا لباس نفیس اور قیمتی نہیں رہا تھا، وہ گھر کے کپڑوں میں ملبوس تھا، جوتوں پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ پچھلا ایڈووکیٹ عبیر اور اس خستہ حال و آشفتہ سر عبیر میں زمین و آسمان کا فرق نظر آ رہا تھا۔ منیجر نے ایک معنی خیز نگاہ حاضرین پر ڈالی۔ ان میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ کچھ متحیر تھے کچھ تماشائی، کچھ خندہ زن۔ عبیر ان کی طرف گھوم گھوم کر بڑے کہنہ مشق مقرروں کی طرح کچھ بکے جا رہا تھا۔

پھر اس پر ہنسنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ انھیں ہنستے دیکھ کر عبیر خود بھی قہقہے لگانے لگا۔

"بس کیجیے۔" اچانک منیجر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "ایک مجبور اور دیوانے آدمی کی حالت پر اس طرح قہقہے لگانا شریفوں کا شیوہ نہیں... کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ ان کی پوزیشن کیا ہے؟... براہ کرم... آپ حضرات اپنا اپنا کام کیجیے" پھر اس نے عبیر کا ہاتھ پکڑ کر کہا "آپ آئیے میرے ساتھ!" وہ اسے لوگوں کے نرغے سے نکال لایا اور [illegible] لا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ اسے کرنل صاحب سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں رہتی۔ کرنل صاحب نے اسے یہ بھی تاکید کی تھی کہ جب عبیر کلب آئے وہ اس پر نظر رکھا کرے۔ یونہی جھوٹ موٹ وہ عبیر کو پروگرام بھی دیتا تھا۔ اور جو چیک اس کی طرف سے کرنل صاحب دیتے تھے وہ معاوضے کے طور پر بڑے ادب سے عبیر کو پیش کر دیتا تھا۔ عبیر کو آج تک اس کا پتہ نہ چلا تھا۔ منیجر کو اس سے اس لیے ہمدردی تھی کہ تھوڑی سی بہت نگرانی کی قیمت کرنل صاحب کی طرف سے اچھی معقول ملتی تھی۔

عبیر صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ منیجر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی سے

"جی ہاں۔ ٹھیک ہے۔ آپ یہاں کچھ دیر آرام کیجئے۔ میں اسے تلاش کرکے لاتا ہوں۔ پھر آپ بے شک اس کا گلا گھونٹ دیجئے گا" منیجر نے کہا۔ اور جب ظہیر واپس اپنے صوفے پر جا بیٹھا تب منیجر نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ کوئی چیز تو نہیں جو اس کے حق میں نقصان رساں ہوتی۔ پھر اطمینان کرکے باہر نکلا اور کمرہ باہر سے بند کرکے بولٹ کر دیا۔

پھر اس نے کرنل صاحب کو فون کرکے صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک ویٹر کو بند دروازے پر متعین کرکے فکرمند صوفے پر آ بیٹھا۔

کرنل صاحب کو فون اس وقت ملا جب کہ شباہت اور ظہیر گھر سے چل چکے تھے۔ ان کی پریشانی کا کیا ٹھکانا تھا۔ بڑی ہمت کرکے خود اٹھے اور لباس پہننے لگے۔ بسلوت جہاں نے مشورہ دیا:۔

"رات زیادہ ہو رہی ہے۔ آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اب تو خدا کے فضل سے پتہ چل گیا ہے۔ شباہت وغیرہ بیرسٹر صاحب کے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انھیں کو فون پر اطلاع دے دیجئے۔ وہیں سے کلب چلے جائیں گے"

ایک مضطرب نظر انھوں نے خلیفہ بیگم پر ڈالی جو اب بھی نقش دیوار بنی بیٹھی تھیں۔ پھر وہ ٹھٹھکے اور پست آواز میں کچھ کہہ کے باہر چلے گئے۔

بیرسٹر صاحب کو بھی کال بعد از وقت ملی۔ شباہت اور ظہیر ان کے یہاں سے مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ رخسانہ کو کرنل صاحب کی تڑپ کا بخوبی اندازہ ہوا۔ انھوں نے بیرسٹر صاحب سے کہا "میں کہتی ہوں کیوں نہ تکلیف کرکے آپ ہی چلے جائیے کلب تک۔ شباہت اور ظہیر صاحب معلوم نہیں کہ کہاں کہاں کی خاک چھان رہے ہوں گے۔ انھیں کلب کا خیال بھی نہ آئے گا۔ آپ اگر ظہیر کو کلب سے واپس لا کر ان کے گھر پہنچا دیں تو بڑا اچھا ہو"

"اچھا جاتا ہوں، مگر مجھے بتاؤ۔ تم سے شباہت نے چپکے چپکے کیا کہا تھا؟"
شباہت نے رخسانہ سے سارا قصہ کہا تھا کہ کس طرح عمیر کے ہاتھ بیرسٹر صاحب کا خط لگ گیا اور کس طرح وہ پاگل دیوانہ بن کر گھر سے نکل گیا۔ رخسانہ نے بیرسٹر صاحب سے بات بتادی۔

"شباہت چاہتے بہت ہیں عمیر کو۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ اچھے ہوتے نظر نہیں آتے۔ اللہ ان کے حال پر رحم کرے۔ کس کام کی یہ زندگی ہے!"

"میں ایک اور صاحب کو جانتا ہوں۔" بیرسٹر صاحب نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا "معلوم نہیں صحیح ہے کہ غلط۔ سنا ہے دو تین دماغی بیماروں کو ان کے علاج سے فائدہ ہوا۔ معاوضہ زیادہ لیتے ہیں۔ مگر اس کی کیا پرواہ —— اچھا میں جا رہا ہوں۔"

رخسانہ اپنے بچے کے پاس لیٹ گئیں۔ نزہت اپنے کمرے میں پردے کی آڑ سے سب کچھ سن رہی تھی۔ اس نے ابھی تک لباس بھی نہیں بدلا تھا۔ کچھ دیر قبل توقیر کی رخصتی کے بعد گھر آگئی تھی اور بہت دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ آج اس کے سارے خواب بے تعبیر سسکتے رہ گئے تھے۔ اس کے دل میں خوبصورت امنگوں کے چھوٹے چھوٹے نازک نازک تاج محل بنے تھے وہ سب منہدم ہو چکے تھے۔ آج توقیر کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر بہت سے شرمیلے شرمیلے ارمان اس کے دل میں بھی انگڑائیاں لینے لگے تھے مگر اب جن کا پتہ نہ تھا۔ دل کے کھنڈر میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ وہ جی بھر کے رونا چاہتی تھی۔ پر ایک آنسو بھی اس کی خشک آنکھوں کو تر نہ کر سکا۔ سینے سے شعلے اٹھتے رہے اور اس کی ہستی چپکے چپکے جلتی رہی۔ دیر تک پردہ تھامے مجبور اور مبہوت سی کھڑی رہی۔ فکروں کی ایک کالی آندھی تھی جو اس کے ذہن میں چل رہی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ ایک احساس البتہ اسے تھا کہ اب وہ عمیر سے زندگی بھر کے لیے جدا ہو گئی۔

رہتا۔ لباس کی پرواہ تو وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ وہ موت
کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جو شروع سے پاگل فلسفی۔ اب تو زیادہ فلسفہ بکنے لگا تھا۔
کسی بات کا سیدھے انداز میں کسی کو جواب نہ دیتا۔

گھر بھر میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ کیونکہ کبھی اس کا جنون شدت اختیار کر لیتا اور کبھی
وہ بالکل گم صم ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ دیا تھا کہ اگر اس کی شادی ہو جائے تو وہ
روبصحت ہو سکتا ہے۔ مگر کون لڑکی تھی جو ایسے شخص سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی
کون والدین بھلا اپنی لڑکی کو جانتے بوجھتے کنوئیں میں دھکا دے دیتے۔

شباہت بمبئی رہ پڑا تھا۔ اپنے گھر وہ صرف ایک مرتبہ آیا۔ اور اپنی نئی نویلی دلہن
سے بات کیے بغیر اپنے بکس ساتھ لے کر پھر چلا گیا۔ توقیر نے دو تین دن روایتی حجاب سے
کام لیا اور پھر اپنی ماں کے ساتھ عنبر کے گھر پہنچ گئی۔ عنبر نے اسے پہچانا نہیں۔ توقیر آہیں
بھرتی رہ گئی۔ شباہت اس کی امی کے پاس آ بیٹھا اور گلوگیر آواز میں بولا:۔

میں بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ کاش میں اپنے دوست کے لیے کچھ کر سکتا۔
اس کا میرا بچپن کا ساتھ رہا ہے۔ ہمیشہ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آتے رہے۔
میرا کوئی حقیقی بھائی بھی مجھ سے اتنی محبت نہ کر سکتا جتنی عنبر نے کی ہے۔ افسوس وہ بھول گیا
مگر میں نہیں بھول سکتا۔ ہائے! کاش!! میں بھی پاگل ہو جاؤں۔ افسوس افسوس!
جس کا چہرہ گلاب کے پھولوں کی طرح شاداب و شگفتہ رہتا تھا۔ آج ایسا وحشت زدہ
رہ گیا ہے۔ جو ہر محفل کی جان تھا وہ گوشہ نشین و بدحواس ہو کر رہ گیا۔ کیا انقلاب ہے
دنیا کا۔۔۔ میرے اللہ! تو میرے عنبر کے حال پر رحم کر۔۔۔ ہائے! میں تمہارے
کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ کہہ کر شباہت رو پڑا۔ امی بھی رو رہی تھیں وہ عنبر کو
بہت چاہتی تھیں۔ عنبر کی یہ حالت ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب دیر تک گریہ
و زاری کا یہ طوفان تھما تو امی نے شباہت سے پوچھا:۔

"میاں پھر علاج کی کوئی سبیل سوچو! آخر کیا کیا جائے؟"

"علاج تو ڈاکٹروں نے بتایا ہے۔ مگر وہ قابل عمل نہیں" شباہت نے کہا "وہ کہتے ہیں کہ واحد علاج شادی ہے... لیکن اس حالت میں کہاں کوئی لڑکی مل سکتی ہے؟"

وہ بے چاری سوچنے لگیں۔ واقعی کوئی لڑکی کہاں ملے گی؟ پھر شباہت اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تب وہ اٹھیں اور تہمینہ بیگم کے پاس جا بیٹھیں۔ ان کا حال ناقابل بیان تھا۔ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھیں۔ لاغر تو پہلے بھی تھیں۔ اب تو پوست استخوان لگتی تھیں۔ پپڑیاں جمے ہونٹ، حلقوں میں دھنسی ہوئی دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، جن پر آنسو خشک ہو کر جم گئے تھے۔ ساری جان سے بے چاری لرزتی تھیں۔ اختلاج اور خفقان زوروں پر تھا کہ منہ سے بات نکلنی دشوار تھی۔ امی کے دل پر بڑا دھکا لگا۔

"دعا کرو اللہ سے بہن" تہمینہ بیگم نے کانپتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے "وہ کوئی بری گھڑی دکھانے سے پہلے مجھے اٹھا لے... اب صبر نہیں ہوتا۔ کیا کچھ نہیں برداشت کیا میں نے"

"یوں جی نہ کھوؤ تہمینہ بہن!" انھوں نے اپنے آنچل سے ان کے آنسو پونچھے، دلاسہ دیا "دعا مانگتی رہو۔ مجھے بڑی امید ہے۔ جس خدا نے یہ مصیبت سر پہ ڈالی ہے وہی خدا یہ مصیبت دور بھی کر دے گا۔ کون سی ایسی بیماری دنیا میں ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ بس وقت آنے کی دیر ہے۔"

"ارے اس کے باپ ہی اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان کے بنائے کچھ نہ بنا تو دوسرے نومشق ڈاکٹر بھلا کیا کر لیں گے" انھوں نے مایوسی اور ناامیدی میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "کتنے ڈاکٹر روز آتے ہیں اور اپنی ناکام کوشش کر کے چلے جاتے ہیں۔ دس بارہ دن گزر گئے۔ مرض بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے... مجھے تو بالکل امید نہیں رہی"

ہر وقت اپنی موت کی دعا مانگا کرتی ہوں۔"

"جو علاج ان لوگوں نے بتایا ہے وہ بڑا مشکل ہے" امی نے کہا" میں اب پچھتا رہی ہوں۔ اگر توقیر کی شادی نہ ہو گئی ہوتی تو میں نگہت کو عبیر سے بیاہ دیتی۔ شاید اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔"

"یہ تمہاری محبت ہے بہن! مگر ہم لوگ گوارا کرتے کہ ایک علاج پر معصوم ناکردہ کار، بے زبان بچی کی بھینٹ چڑھے۔"

"اور پھر دوستی، محبت اور خلوص کے کیا تقاضے ہیں۔ نہ دیکھے کا ایثار بھی کوئی ایثار ہوتا ہے۔ دوسرے کے پسینے پر اپنا خون اسی وقت بہتا ہے جب دل کی رگیں کانپ جائیں۔ یہ کام اخلاص کی خاطر کوئی دشوار نہیں۔"

"بہن! آپ کا سا دل کوئی کہاں سے لائے؟"

وہ بہت روتی رہیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ شام کی گاڑی سے انھیں جانا تھا۔ رہبان سب جا چکا تھا۔ ان کی روانگی ناگزیر تھی۔۔۔۔ وہ عبیر کو دیکھنے باہر پہنچیں سر پر ساتھ تھی۔ آج اس کی ساری خوشیاں سوگواریوں میں بدل کر رہ گئی تھیں۔ بس بات کرتے روئے پڑتی تھی۔

عبیر کو دیکھ کر توقیر کی والدہ سکتے میں رہ گئیں۔ وہ پہلی نظر میں اسے پہچان ہی نہ سکیں۔ میلا لباس، جوگیوں کے سے بال، سرخ اور وحشت زدہ آنکھیں، ایک مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ انھیں دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔

وہ پاس والی کرسی پر آ بیٹھیں۔ سر پر کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو گئی نگہت کا ہم شباہت، ظہیر اور دوسرے لوگ دور دور صوفوں پر بیٹھے سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔

انھوں نے عبیر کو پکارا۔ مگر وہ اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔ انھیں جواب نہیں دیا

"تیمور بیٹے! کیسی طبیعت ہے؟" انھوں نے بے حد پیار سے اس کا سر سہلا کر پوچھا "آج تم نے مجھے سلام بھی نہیں کیا۔ دیکھو میں آج جا رہی ہوں۔ تم تو کہتے تھے کہ میرے ساتھ جاؤ گے۔ پھر یہ کیا ہے کہ تم یوں گم صم بیٹھے ہو۔ اٹھو، نہاؤ دھوؤ، کپڑے بدلو!"

وہ ان کا چہرہ تکنے لگا۔ سمجھا خاک نہیں۔

"میاں! تم تو تیمور کے بڑے بھائی بنتے تھے" انھوں نے کہا "کہتے تھے کہ اسے اکیلا پن محسوس نہ ہونے دو گے۔ واہ میاں واہ! کیا خوب اپنا کہا کرایا بھول کر بیٹھ گئے ہو"

"تیمور!..." اس کے ہونٹ کانپے۔ اس کا جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا۔ "کہاں ہے تیمور؟"

"بیٹے وہ اندر ہے۔ آئی ہے میرے ساتھ۔"

"وہ لڑکی ہے تیمور۔ اٹھو! پھر سے خوش ہو گی" اس نے یہ کہہ کر ایک ہاتھ سے تھام لیا اور پھر کچھ دیر کی غضب ناک ہو گیا "اس نے مجھے ستایا ہے، دیکھیے! میں پھر سے مار ڈالوں گا۔ دیکھیے، دیکھیے۔ یہ مجھے منہ بنا کر چڑھا رہی ہے"

حالانکہ بے چاری سریہ سہمی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی اس کی رونی رونی سی آواز نکلی تیمور اپنی جگہ سے جھپٹ کر پہنچا اور سریہ کو اپنی طرف کھینچ کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سریہ تو کانپ رہی تھی۔ ایک ڈری ڈری سی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اس نے نیم جان ہو کر تیمور کے بازو پر سر رکھ دیا۔

سب اس کی طرف جھپٹے۔ بڑی مشکل سے سریہ کو اس کے آہنی بازوؤں سے چھڑایا۔ وہ بے چاری نیم جان و نیم بے ہوش تیمور کی امی کے آغوش میں سر رکھ کر سسکنے لگی۔

موقع ملے کہ نہ ملے۔ پل بھر کا بھروسہ نہیں ہے زندگی کا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی حسرت لیے چل بسوں۔ اللہ سے دعا کرتی جاؤں گی۔ وہ آخر بھابی کو بیٹے کی خوشیاں دکھائے۔"

عمیر پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ شباہت نے ڈرتے ڈرتے اسے بستر پر لٹایا اور سینہ تک شال اڑھا دی۔ چند لمحوں بعد وہ بے خبر سو گیا۔

ملازم کو اس کی نگرانی پر چھوڑ کر وہ سب اندر آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ توقیر سو رہی ہیں۔ شباہت انھیں چھوڑنے گیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد سمیرہ بھی پہنچی۔ نزہت پہلے سے موجود تھی۔ اور بھی لوگ تھے جو امی کو رخصت کرنے آ گئے تھے۔

توقیر، نزہت اور سمیرہ کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی۔ نئی نویلی دلہن جس کا دولہا بھی اس کی تنہائی رفع کرنے اور ماں کی جدائی کا غم بٹانے کو اس کے پاس نہ تھا۔ وہ تو اس سے ملا بھی نہیں تھا۔ باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ رفاقت تو درکنار۔ شاید اس نے ڈھنگ سے توقیر کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

وہاں سب ہی پریشان اور دلگیر تھے۔ کون کس کو تسلی دیتا۔ نزہت سوچ رہی تھی کہ یہ سب ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کو آخری بار مل رہے ہیں۔ پھر یہ خاموش حویلی ہوگی کہاں یہ لوگ کہاں۔ یہ صورتیں کہاں — ایک سناٹا ہوگا، خلا ہوگا، اپنا کوئی نظر نہ آئے گا۔ یہ محبت کرنے والے لوگ کتنی دور چلے جائیں گے۔ جہاں تک پہنچے خیال کے پر جلنے لگیں گے۔ وہ بھی رو رہی تھی، سمیرہ اتنی جذباتی اور حساس نہیں تھی وہ بظاہر غیر اہم انداز میں لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کا سارا دھیان عمیر کی طرف لگا تھا۔ وہ اسے بے حد چاہتی تھی۔ دسے ستاتی تھی، چھیڑتی تھی، خفا ہوتی تھی مگر عمیر نے کبھی اسے ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا۔ اس کی شوخی پر بل بھی نہیں آتا تھا۔ ہنس ہنس کر وہ اسے بچے کی طرح کھلاتا تھا۔ عمر میں بھی سمیرہ اس سے دس گیارہ سال چھوٹی تھی۔ مگر کبھی جیسے اپنی بزرگی نہیں جتائی تھی۔ برابری کا سلوک کرتا تھا۔ کتنا عجیب

خوش مزاج، اور پر محبت آدمی تھا۔ اور اب ـــ بیمار سے بدتر ہے۔ خدا جانے اچھا ہو کر نہ ہو۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرنا پڑے۔ وہاں اس کا کیا حال ہوگا۔ کیا نیر جیسا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپٹوڈیٹ آدمی پاگل خانے چلا جائے گا؟ سر پر کی آنکھوں تلے بیمار کا زرد چہرہ پھرنے لگا اور وہ توقیر کی امی سے جدائی کا بہانہ کرکے زار قطار رونے لگی ـــ

مغرب کے وقت وہ سب اسٹیشن پہنچے۔

توقیر بے چاری روتے روتے تھک چکی تھی۔ اب خود کو سمجھانے لگی تھی کہ جو ہونا ہے وہ ہوا۔ بیکار کی گریہ وزاری تقدیر کے حالات کو قطعی نہیں بدل سکتے۔ ٹکٹکی باندھے ماں کا مقدس چہرہ تکے جارہی تھی جو کچھ دیر میں ہمیشہ کے لیے دور ہونے والا تھا۔

اچانک ٹرین کی دردناک سیٹی کہیں دور فضاؤں میں گونجی اور توقیر کا دل دہل گیا۔ بہت سے لوگ حج کرنے جارہے تھے۔ ٹرین کے ڈبے پھولوں سے سجے ہوئے تھے۔ مسافروں کو ان کے عزیز و اقارب پھول پہنا رہے تھے۔ فضا تکبیر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ عجیب سا متاثر کردینے والا شور ہر طرف چھایا ہوا تھا۔

ریل نے دوبارہ سیٹی دی۔ بہت سا کالا کالا دھواں انجن سے اٹھا اور بل کھاتا ہوا خلا میں پھیلنے لگا۔ توقیر نے سسک کر ماں کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"اچھا بیٹی! اب مجھے رخصت کرو۔ رو نے دل بھاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میری بچی! خوش ہونے کی بات ہے۔ اللہ نے میرے نصیب میں حج کی سعادت لکھی تھی۔ تمھیں خدا پر مسرت زندگی گزارنی نصیب کرے۔ اب میں جاتی ہوں

سب ان سے ملنے لگے۔ کرنل صاحب کا دل بھرا آرہا تھا۔ ان کے ہاتھ تھام کر اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے لگا لیے اور گلوگرفتہ لہجے میں بولے ہو بہن اپنی

راستے میں سرور نے امی سے کہا "شبو بھیا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمارے گھر چلئے۔ مدحت بھی ابّن کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہیں۔۔۔ دیر نہیں لگے گی۔ واپسی پر انہیں بنگلے پر پہنچا کر آپ اپنے گھر چلے جائیے گا"

"کہاں کا میرا گھر" شباہت نے جواب دیا "مجھے بھی امی کی طبیعت خراب ہے انہیں دیکھنے امی کا بند بھی گئی ہیں۔ بچا جان نے اکیلے پن کے خیال سے مجھ سے کہا تھا کہ جب تک امی واپس نہیں آجاتیں ہم دونوں انہیں کے یہاں رہیں اور اس کے علاوہ میں خود بھی ظہیر کو اس حال میں چھوڑ کر گھر نہ جاؤں۔ آہ کیسا دل بھر آرہا ہے"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے" سرور بے حد خوش ہو کر بولی "آپ اور توقیر ہمارے یہاں رہیں گے تو کیسے مضبوطی معلوم ہوگی۔ تو پھر آپ دونوں اب ہمارے ہی یہاں چل رہے ہیں نا؟"

"ہاں" شباہت نے کہا۔

"مجھے گھر پر چھوڑ دیجئے شباہت بھائی!" مدحت نے بڑی اداس اور غم انگیز آواز میں کہا "شادی اور بھائی جان گھر پہنچ گئے ہوں گے۔ مجھے دیر ہوگی تو نہ جانے وہ لوگ کیا خیال قائم کریں؟"

"دیر کیا لگے گی؟" شباہت نے کہا "تم دیکھنا چاہتی ہو ظہیر کو؟ دور سے دیکھ کر چلی جانا۔ ان کے پاس جانے کی ممانعت کر دی ہے! منع کر دیا گیا ہے سب کو" مدحت کے دل پر برچھی سی چبھنے لگی۔ کیا یہ نوبت آگئی؟ وہ اپنے آنسو چھپانے کو اس نے رخ پھیر لیا۔ کار ٹھیر کر رک گئی۔ شباہت مردانے میں چلا گیا۔ سرور مدحت اور توقیر کو اپنے ساتھ لے مدحت سہمی ہوئی تھی۔ توقیر بھی بہت خاموش ہو رہی تھی۔

رات کا سوگوار سکوت در و بام پر چھایا ہوا تھا۔ دالان میں ایک تیز پاور کا بلب جس کی نیلگوں روشنی ماحول کو زیادہ منحوس اور وحشت انگیز بنا رہی تھی۔

چلمن سے اوپر جھانکا اور اشارے سے مدحت کو اپنے پاس بلا لیا۔

ادھر اُدھر دیکھ کر مدحت اس کے پاس پہنچ گئی۔ سمیرہ نے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چلمن سے پردہ سرکا دیا۔

کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چیز پر مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ ایک گوشے میں اونچی کرسی پر بیٹھی ایک نرس ...... کوئی کتاب پڑھ رہی تھی... مدحت کی گھبرائی ہوئی نگاہیں ایک شے پر سے پھسلتی ہوئی بالآخر مسہری پر لیٹے منیر پر جا کر رک گئیں۔

اسے پہچاننے میں تامل ہوا کہ وہ جسے دیکھ رہی تھی وہی منیر تھا۔ اس نے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ کیسا وحشی اور بھیانک سا چہرہ تھا۔ جس پر وحشت کے سناٹے اور بے بسی کے سائے بھی بکھرے تھے۔ جسے دیکھ کر بے ساختہ رحم و محبت کے جذبات سینے میں موجزن ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ جھلسے گالوں کے نیچے دبائے سو رہا تھا۔۔۔ مدحت پردہ تھامے کھڑی رہی اور آنسو اس کی آنکھوں میں اکٹھا ہوتے رہے۔

"کیوں منو - پہچاننا ناممکن ہو رہا ہے؟" سمیرہ بولی۔

مدحت کے موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر گرنے لگے "اللہ میاں میری زندگی انھیں دے دیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا سمیرہ... کیا اب کچھ بھی لوٹتے جاتے ہیں؟"

"بہت کم۔ زیادہ الفاظ کیا اب ... اور پھر وہ ناقابل فہم باتیں ——"

"ڈاکٹروں کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا؟" توقیر نے پوچھا۔

"علاج؟" سمیرہ ایک ادھوری مگر معنی خیز نظر مدحت پر ڈال کر بولی "ہاں ہوا تو ہے مگر وہ ناقابل عمل ہے"

"کیا مطلب؟" مدحت نے پوچھا۔

"وہ واحد و موثر علاج شادی بتاتے ہیں" سمیرہ نے کہہ دیا اور یہ نہیں سمجھ سکتا کوئی مال؟

راضی نہیں ہوتے۔ نہ کوئی لڑکی آمادہ ہوتی ہے۔"

"اللہ۔ اللہ۔۔۔!" مدحت نے دل تھام لیا "جب میں اتنا سا ایثار بھی نہیں کر سکتی تو میرا جینا کس کام کا؟"

"آؤ چلیں مدحت! دیر ہو گئی" شباہت وہاں آگیا۔

"پھر کب آؤ گی مدحت؟" سریہ نے بہت خوشامد سے پوچھا۔

"میرا جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔ہمیشہ کے لیے یہیں آجاؤں۔"

مدحت نے ایک دبی ہوئی سسکاری بھر کر کہا۔" اپنی زندگی دے کر انھیں موت کے ہاتھوں سے کھینچ لوں۔ میرے بس میں کیا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ تمنائیں ایک دعا بن کر رہ گئی ہیں۔۔۔ کاش قبول ہو جائے۔"

پھر وہ ایک آخری نظر عبیر پر ڈال کر چلی گئی۔ سریہ اور توقیر کی نگاہیں ملیں ان میں یہی سوال اپنے جواب کے لیے مچل رہا تھا "کیا مدحت ایسا ایثار کر سکے گی؟۔۔۔۔"

مدحت گھر گئی تو اپنا سب کچھ عبیر کے پاس چھوڑ گئی۔ اتنی بدحواس اور [illegible] ہو رہی تھی کہ رخسانہ کے استفسار پر اس نے دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ نہ اس نے اپنے رشتے ناطے کا خیال کیا' نہ بیرسٹر صاحب کے خوف نے اسے باز رکھا وہ دل اور آنکھوں کی زبان سے بول رہی تھی۔ بہت متاثر انداز میں اس کی کیفیات کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ پھر وہ اپنے تذکرے کے اختتام پر رونے لگی۔ اور گریہ آلود آواز میں بولی۔

"انسان کے ہاتھ میں انسان کی تقدیر اگر ہوتی بھابی! تو میں اس مجبور آدمی کو مرنے سے بچا لیتی۔ اب کوئی ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جہاں تدبیر بے بس اور

تقدیر خندہ زن ہو وہاں چارہ گر کی کوشش بیکار ہو جاتی ہے۔ بھابی! کیا وہ
مجبور آدمی نہیں اتنی ہی سی زندگی لے کر آیا تھا۔ ایک دیوانی، گونگی اور بدحواس
ناکام زندگی گزار کر مر جانا کتنا حسرت ناک انجام ہے۔ کون ہے اس وقت جو
انھیں ہوش مندی کی سانسیں دے سکے۔ کوئی نہیں۔ آہ۔ انھیں یونہی سب
نے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہائے بھابی!
کہاں ہیں وہ انسان جو کسی کی خاطر جان کی بازی لگانا بالکل معمولی بات سمجھتے
تھے۔ کہاں ہیں وہ فرشتہ خصلت دوست جو ایثار و قربانی کے زبانی راگ الاپتے
ہیں مگر عملی ایثار سے دور بھاگتے ہیں۔۔۔۔ بھابی! کاش!! میں ان کے لیے
کچھ کر سکتی۔۔۔۔ مجھے اپنی زندگی پر اختیار دیجئے۔ تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔۔ میں
ان کا علاج بن جاؤں۔“

رخشانہ تو اس کے منہ سے یہ باتیں سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ مگر دانش صاحب
بھی کچھ کم حیران نہ تھے۔ وہ دوپہر ہی کو عدالت سے آ گئے تھے۔ اور کھانے
کے بعد آرام سے بیٹھے حقہ نوشی کر رہے تھے۔ مدحت کی باتیں سن کر یا ئیپ ان
کے ہاتھ سے [illegible] بچا۔۔۔۔ دم بخود رہ گئے۔ پہلے تو انھیں سخت غصہ
آیا اور وہ بیٹی کو [illegible] کی کوشش کرنے لگے۔ ذرا دیر پیچ و تاب کھانے
کے بعد جب ٹھنڈے دل سے سوچا تو واضح ہوا کہ وہ خود غلطی پر تھے۔ خیر سے اگر
انھیں دیکھ [illegible] کی بیٹی [illegible] کیونکہ اس سے دوستی کی بنا تھے یا دشمنی
وہ [illegible] سخت [illegible] تھی اب [illegible] بھی اپنا غصہ
اتارنا فضل [illegible] معاملہ تھا [illegible] آخر میں موت کی منزل سے ملتا
تھا۔ چاہے [illegible] جبر و استبداد کے لاکھوں پہرے بٹھائیے۔ محبت ہر قید و
بند کو توڑ کر اپنا راستہ [illegible] راہیں پیدا کر لیتی ہے۔ ہزار وہ مادی [illegible]

ملاحت کو بیرسٹر سے دور رکھتے مگر روحانی طور پر تو اس کے پاس ہی تھی۔ پھر کیا یہ بیکار کا غصہ، سخت گیری، ظلم اور جبر — کیوں نہ اس معاملے پر سنجیدگی اور بردباری بلکہ ہمدردی سے سوچا جائے۔ انھیں ملاحت کی بے زبانی اور بے بسی پر بھی طیش آتا تھا۔ ہرگز منہ سے کسی سے ظلم کے خلاف احتجاج نہ کرے گی چاہے جان دے دے۔ یہی کتنا بڑا احتجاج ہے۔

وہ اٹھ کر دالان میں آ گئے۔ ملاحت نہیں تھی۔ رخسانہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی دکھائی دیں۔ بیرسٹر صاحب پر نظر پڑی اور وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔ ملازم جھاڑن لیے ایک ایک چیز صاف کرتا پھر رہا تھا۔ اسے دانش صاحب نے ایک ڈانٹ بتا کر ہٹا دیا اور خود بیوی کے پاس آ بیٹھے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص فکر پریشان کر رہی ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" وہ کچھ خفا سی معلوم ہو رہی تھیں۔

"ابھی کون بیٹھا تھا تمھارے پاس۔ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"ملاحت تھی"

"کیا کہہ رہی تھی .....؟"

رخسانہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور مشکوک لہجے میں بولیں "کیا آپ کو بتانا ضروری ہے؟"

"بالکل نہیں۔ یونہی پوچھ لیا تھا۔" وہ قانونی راہ پر آتے ہوئے بولے "اچھا بھئی سنو! میں اس طرف مسلسل سوچ رہا ہوں کہ ملاحت نے اپنی تعلیم ختم کر لی ہے۔ تم نے اس دن کہا تھا کہ آئندہ [illegible] کام آنے والا سارا سامان [illegible] بھی تم نے جمع کر لیا ہے۔ لہٰذا اب اس کی شادی میں اب دیر نہ کرنی چاہیئے۔ میرے ایک شناسا ہیں۔ ان کے بھتیجے نے اسی سال 'لا' کیا ہے۔

حال کافی ان کے پاس آتے ہیں۔ ویسے اپنے گھر سے کافی خوشحال ہیں۔ میں نے باہر اپنی تحقیق مکمل کرلی ہے۔ چاہتا ہوں کہ ایک دن تم عورتوں کا حال اور ان کا رہن سہن بھی دیکھ آؤ۔ تو پھر۔ ایک جواب کہلوادیں "

"جواب کہلوادیں؟" رخسانہ نے حیرت سے کہا "انھوں نے سوال کہاں کیا ہو؟"

"تمھیں معلوم نہیں مجھ سے بارہا کہا ہے" دانش صاحب نے کہا اور وہیں پر چونک گئے۔ کیونکہ ان کے اس جواب سے رخسانہ بھڑک اٹھیں۔

"تو پھر دے دیجئے جواب۔ ان کے سوال کرتے وقت میں نہ تین نہ پانچ۔ پھر میں کون سے کھیت کی مولی ہوں کہ مجھ سے ایسے اہم معاملے میں رائے لی جاتی۔ آپ ان کے سگے بھائی ہیں باپ کے برابر..... میں غیر۔ بھاوج کا رشتہ یوں بھی بڑا ہوتا ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا میں نے کردیا۔ باقی معاملات آپ سنبھالیے"

"اس میں اتنی خفگی کی کیا بات ہے؟"

"آپ نے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ کیا میں نے ایک بڑی بہن کی طرح مدحت کو نہیں پالا پوسا؟ کیا میں اس کی کوئی نہیں؟ شادی بیاہ کے موقع پر آپ نے میری رائے لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ بالا بالا گھر بار خاندان اور لڑکا دیکھ لیا۔ سب کچھ طے کردیا۔ پھر اب مجھ سے جواب مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اس کا اچھا برا کہاں سوچ سکتی ہوں؟"

دانش صاحب محض گپ ہانک رہے تھے۔ نہ کوئی خاندان تھا نہ لڑکا تھا۔ وہ بھی مرضی پوری ہوئی۔ رخسانہ نے صاف صاف اپنی برہمی کے پردے میں پوشیدہ نامرضی کا اظہار کردیا تھا۔ اور پھول کر رخ پھیر لیا۔

"اچھا بھئی! مجھ سے قصور ہوا" وہ زیر لب مسکرا کر بولے "میں نہیں جانتا تھا کہ تم کو مدحت سے اتنی محبت ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے اس کی بہتری کے لیے کیا سوچا ہے؟"

"کیا کروں آپ کو بتا کے؟ بس اللہ پورا کرادے تو کرادے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں رخسانہ! میں نے مدحت کی تمام باتیں سنی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے اور تم کیا چاہتی ہو؟"

"وہ بچی ہے۔ بہت جلدی کسی بات سے متاثر ہو جاتی ہے۔ خدا کے لیے اسے کوئی سزا نہ دیجیے گا۔"

رخسانہ کے اس طرح کہنے پر دانش کو اندازہ ہوا۔ رخسانہ کو سچ مچ مدحت سے محبت تھی۔ انھوں نے رخسانہ کے خائف چہرے پر دزدیدہ نظر ڈالی اور دونوں ہاتھوں کا سرہانہ بنا کر تخت پر لیٹتے ہوئے کہا "اسے سزا دینے کا سوال تو اس وقت اٹھتا جبکہ میں اس سے مختلف سوچتا۔"

"کیا مطلب... کیا آپ بھی ـــــ؟" رخسانہ مسرت سے مغلوب ہو گئیں۔

"ہاں میں بھی اب یہی سوچ رہا ہوں" دانش نے کہا "میں نے خوب اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ پہلے بے شک مجھے غصہ آتا تھا۔ جب میں یہ سوچتا تھا کہ معاذ صاحب جان بوجھ کر پاگل پن کی اداکاری کر رہے ہیں۔ تاکہ باپ کی کثیر دولت ہتھیا ئیں۔ مگر میرا نظریہ بہت پہلے بدل گیا تھا۔ جب وہ غریب مجھ سے گفتگو کرتے کرتے بے اختیار رونے لگے تھے۔ انھیں بخوبی احساس تھا کہ وہ اپنی دماغی بدحالی کی بنا پر اپنے بوڑھے باپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اس وقت میں نے سوچا تھا کہ معاذ صاحب کا پاگل پن یا ان کی یادداشت کی کمزوری فرضی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ مجھے ان پر بہت ترس آیا اور میں نے خیال کیا کہ اگر یہی ایک ذہنی عیب ان میں نہ ہوتا تو وہ لاکھوں میں ایک ہیں۔"

دانش کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ رخسانہ بہت حیرت سے بہت تعجب سے ان کا چہرہ تک رہی تھیں۔ انھیں شک ہوا کہ کہیں وہ دوسرے کے دل کی بات جاننے کے لیے

تو یہ تدبیر نہیں کر رہے ہیں۔ مگر واقعی ان کے تپانے سے صداقت جھلک رہی تھی۔
رخسانہ نے سوچا آدمی کو انسان بنتے دیر نہیں لگتی۔ صرف سمجھ بوجھ کا معاملہ ہے۔ وہ اس وقت خوش تھیں جیسے انھیں کسی نے بے طلب خزانہ بخش دیا ہے.... دانش چند لمحے چپکے لیٹے کچھ اور سوچتے رہے پھر بولے

"اختر صاحب کی حالت پر واقعی دل کڑھتا ہے۔ جیسا کہ ایک روز تم نے کہا تھا ہمارا بچہ بیمار ہو گیا تھا تب ہم کو اپنی زندگیاں کھلنے لگی تھیں۔ یہ تو بہت چھوٹا سا دکھ ہے۔ مگر کیا کہتا ہو گا کرنل صاحب کا دل۔ ان کا بیٹا تو پہاڑ ہے پہاڑ۔ ایک دن میں ارشاد صاحب کی تعریف سن کر انھیں بغرض علاج لے گیا تھا۔ مگر وہ بالکل جنگلی ثابت ہوئے۔ ایک اور صاحب کی تعریف سن رہا ہوں انھیں کو لے جاؤں گا۔"

"آپ ہی کی کوششوں سے خدا انھیں صحت دے سنا ہے کہ اب حالت اور خراب ہے۔"

"بالکل آپے سے جاتے رہے ہیں۔ بڑا افسوس ہوتا ہے۔ پرسوں شام کو عدالت سے واپسی پر شباہت مل گئے۔ کہہ رہے تھے کہ اندھیر مچا ہوا ہے".... وہ اٹھ کر بیٹھ گئے "تم اگر جانا چاہو تو جا سکتی ہو دیکھ آؤ۔ بیگم الطاف کے حج پر جانے کے بعد سے ان کی بچی توقیر اور شباہت بھی مستقل طور سے کرنل صاحب ہی کے یہاں مقیم ہیں۔ اُن سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

رخسانہ نے مدحت کو بھی ساتھ لے جانے کی اجازت مانگنی چاہی مگر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہیں۔

"شام کو میں ڈاکٹر کے ساتھ وہیں آؤں گا۔ تم ادھر سے چلی جانا۔ مگر مدحت کو نہ لے جانا۔ وہ حساس زیادہ ہے۔ معلوم نہیں کیا اثر لے کے پلٹے۔"
وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ رخسانہ کو خوشگوار خیالات میں غرق چھوڑ گئے۔

راحت اپنے کمرے میں تھی۔ اور جس طرح دانش نے ان کی باتیں سنی تھیں اس نے بھی ان کی تمام باتیں سن لیں۔ اسے اپنی تقدیر پلٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ گم صم سی وہ بھی رہ گئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر رخسانہ نے آرام کیا اور پھر لباس بدل کر کرنل صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئیں۔ دانش بہت پہلے جا چکے تھے۔ راحت باہر نکلی۔ تخت پر ننھا سو رہا تھا۔ اس نے سوتے ہوئے بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

کرنل صاحب کی کوٹھی پر غیر معمولی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رخسانہ کو خلاف امید یہاں دیکھ کر لڑکیاں ان کے آس پاس اکٹھا ہو گئیں۔ سریر جو ہمیشہ ہنستی گاتی چہکتی رہتی تھی۔ آج اتنی اداس اور افسردہ تھی کہ اسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ نکھر گئی تھی۔ چند روز کی بیاہی دلہن تھی مگر پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ روز مرہ کے سے سادہ سوتی کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نہ کوئی زیور نہ نشان نہ مہندی۔ بہت دلگیر اور گم صم تھی۔ شیفتہ بیگم کو دیکھ کر رخسانہ تحت الثریٰ میں اترنے لگیں۔ ایسا حال انھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ بے چاری ہڈیوں کا ڈھانچہ تھیں۔ سینے میں سانس چلتی تھی۔ آنکھوں میں دید کی امید تھی اور بس . . . رخسانہ نے ان کے پاس جا کر بہت جھک کے انھیں سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی! اچھی تو ہو؟" انھوں نے انھیں اپنے قریب بٹھا لیا۔

"خالہ جان . . .! آپ کو دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ یوں آپ بدہمت ہو گئیں تو چھوٹوں کا کیا حشر ہوگا؟ اللہ سے ناامید نہ ہوئیے۔ معلوم نہیں اس کی کیا مصلحت ہے۔ آپ رونے کیوں لگیں خالہ جان! دعا مانگئے۔ کون سا مرض دنیا میں ایسا ہے جس کی دوا اللہ نے پیدا نہیں کی۔" انھوں نے بڑی اپنائیت سے شیفتہ بیگم کے آنسو پونچھے۔

"بیٹی! مجھ اندھی کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ معلوم نہیں پروردگار نے کیوں دنیا میں رکھ چھوڑا ہے۔ اچھے اچھوں کو موت آئی جا رہی ہے۔ نہیں آتی تو مجھ بدقسمت کو نہیں آتی۔ کیسی بے بسی آدمی کی ہے کہ زندگی بس میں نہ موت اختیار میں۔"

"ہائے ہائے خالہ جان! ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ کو اللہ نے اسی لیے تو دنیا میں رکھا ہے کہ اپنے بیٹے کی خوشیاں دیکھئے، خوش ہوئیے۔ ناامیدی کی باتیں خدا کو پسند نہیں۔"

وہ چپ رہیں۔

"آئیے خالہ جان! مجھے پہنچا دیجئے۔ معاذ بھائی کے پاس.... دیکھوں مجھے پہچانتے ہیں کہ نہیں۔"

"بیٹی! ان کے نزدیک نہ جانا۔" وہ ایک جانگسل آہ بھر کر بولیں "اب یہ دن تقدیر نے دکھایا ہے کہ لوگ ان کے پاس جاتے ڈرتے ہیں۔ ابھی اس دن سریہ کو پکڑ کر انھوں نے یوں بھینچا کہ غریب لڑکی کی سانسیں رک رک گئیں.. بس جب سے تمھارے چچا نے منع کر دیا ہے کہ ان کے قریب کوئی نہ جائے۔"

"کوئی نہ کوئی تو جاتا ہی ہو گا؟ آخر ان کا کھانا پینا، نگرانی یہ سب کچھ ـــ"

"ہاں۔ تمھارے چچا، شباہت اور ہسپتال کا ایک آدمی ہمیشہ پاس رہتا ہے۔"

"میں جاؤں خالہ جان پھر؟"

"بچی! مجھ میں تو دو قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں۔ سریہ یا توقیر کو آواز دو۔ وہ پہنچا دیں گی۔" وہ تھکی تھکی سی گاؤ تکیے پر لیٹ رہیں۔ رخسانہ کو نمبر کا کمرہ معلوم تھا وہ کسی کی مدد کے بغیر ادھر چلی گئیں۔ پردہ ہٹایا۔ دروازہ کھولا اور چپکے سے

دیکھا کہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ نرسنگ آرڈرلی البتہ تھا۔ اور شباہت وغیرہ ہمیشہ کی طرح کمرے ہی میں موجود تھے۔ آہٹ سن کر سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔ عبیر ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ مگر اسے رخسانہ نے نہیں پہچانا۔ ہیئت ہی ایسی تھی۔ لمبے لمبے الجھے ہوئے سر کے بال، داڑھی مونچھیں، پُرشکن لباس۔ رخسانہ نے خیال کیا کہ وہ بھی شاید ہسپتال سے انگیج کیا ہوا میل نرس ہے۔

"آیئے بھابی!" شباہت نے ایک پژمردہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تسلیم کرنل صاحب!" رخسانہ نے سر پہ آنچل اوڑھ کر ادب سے انھیں سلام کیا اور ان کے پاس آ بیٹھیں۔ پھر ایک اچٹتی نظر عبیر کے سلگتے بستر پر ڈال کر پوچھا:
"معاذ بھائی کہاں ہیں۔ شباہت؟"

"معاذ؟" شباہت نے نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا۔ اور کرنل صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ بے چارے ایک ہلکی سی سانس لے کر بولے "معاذ۔ بیٹے! ملو گے نہیں ان سے؟ تم تو انھیں اچھی طرح پہچانتے ہو۔" ان کی نظروں کی متابعت میں رخسانہ نے ادھر دیکھا جدھر عبیر تھا۔ اور وہ سکتہ میں رہ گئیں۔ پہلی نگاہ میں تو کیا انھوں نے اسے متعدد بار دیکھنے پر بھی باور نہیں کیا کہ وہی عبیر تھا۔ پھر جیسے ہی ان کی اور عبیر کی نظریں ملیں۔ جھٹ سے رخسانہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک سردی سی پورے بدن میں پھیلنے لگی۔

"وہ مسکرایا اور رخسانہ کو دیکھتا ہوا بولا "مگر وہ شبیہ نہیں ہے" اور پھر سر جھکا لیا۔ رخسانہ نے بڑے حوصلہ افزا لہجے میں پوچھا "بتایئے معاذ صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟" عبیر انھیں خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور دفعتہً بھیانک قہقہہ لگایا۔ "پہچانا کیوں نہیں۔ تم وہی تو ہو جسے میں روز یاد کرتا ہوں" پھر وہ اچانک

اپنی جگہ سے اٹھا اور رخسانہ کے پاس آکر جھکا "سنو! تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ کسی سے نہ کہنا۔ ہرگز نہ کہنا۔ ورنہ یہ لوگ... جو اپنے آس پاس تم دیکھ رہی ہو تم کو اور مجھے پکڑ کر پھر کسی اندھیرے کمرے میں بند کردیں گے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ دیکھا۔ پھر بھول گیا۔"

اس نے جھنجلا کر اپنے جھنڈ ایسے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ رخسانہ کا یہ حال تھا کہ ساکت و دم بخود تھی۔ کرنل صاحب اور شباہت اس کے داہنے بائیں کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر اسے ان کی موجودگی کی پرواہ نہیں تھی۔ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے مڑا۔ اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر سر جھکا لیا۔ جیسے کسی دقیق مسئلے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہو۔"

"خدا کے لیے بتاؤ! میں کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے سر اٹھایا اور گھگھیا کر بولا۔

"پھر کبھی سوچ لینا بیٹے! ذہن پر بوجھ نہ ڈالو" کرنل صاحب نے کہا۔

"بتاؤ!" وہ دہاڑا "ابھی۔ اسی وقت... خدا تمھیں غارت کرے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں۔ یہ کون کھڑا ہے میرے سامنے؟ سنو تم خدا کو مانتے ہو۔ خدا ہی کے واسطے میرا اتنا کہا مانو کہ اسے بلا لاؤ جسے میں یاد کر رہا ہوں۔ اس کا نام کیا ہے؟ تم نام نہیں جانتے؟ میرے سینے میں اس کا نام ہلچل مچا رہا ہے۔ ہونٹوں تک نہیں آتا... میرے دماغ میں قیامت برپا ہے۔ میں اس کی شکل کی تصویر بھی نہیں بنا سکتا۔ ورنہ۔ میں تم کو بتاتا کہ۔۔ وہ کتنی حسین ہے۔ اف۔ اف! میرا سر چکرا رہا ہے۔ وہ کیوں نہیں جاتی۔ خدارا مجھے لے چلو اس کے پاس۔ اگر وہ یہاں نہیں آتی۔"

"وہ آجائے گی۔ خیر! تمھارے پاس۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تکلیف نہ کرو۔" شباہت نے کہا۔

"آپ مجھے کیوں روک رہے ہیں؟" اس نے خوشامد سے کہا "آپ سب نے
اسے مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ کیا میں اب بھی نہ ملوں اس سے؟ میں اس سے ملوں
گا۔ میں اسے اپنے گیت سناؤں گا۔ درد دل کہوں گا۔ اس کے پاس بیٹھوں گا اور
اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا ہوں.... خدارا مجھے نہ روکیے۔ جانے دیجیے۔

"مجھ پر رحم کرو معاذ!" کرنل صاحب نے کہا اور نا امید و مایوس ہو کر ادھر سے
ہٹ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھے جو دروازے کے نزدیک تھا۔

اس پر دوبارہ خاموشی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ رخسانہ کے
حواس درست ہوئے۔ اتنے میں باہر سے دانش کی آواز آئی:-

"میں آسکتا ہوں جناب کرنل صاحب؟"

رخسانہ اندر چلی گئیں۔ کرنل صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دانش ایک
اور صاحب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ نووارد غیر ملکی تھا۔ سرخ و سفید رنگ
گہری نیلی آنکھیں۔ بھاری بھر کم ڈھلتی ہوئی عمر۔

"آپ سے ملیے ڈاکٹر ہول گیٹ فرانسس سائیکو انیلسٹ" دانش نے
تعارف کرایا۔ پھر قدرے خم ہو کر کہا "اور ڈاکٹر آپ ہیں کرنل اختر حسین... مریض
کے والد محترم"

دونوں نے بڑے خلوص سے مصافحہ کیا۔ عنبر نے ایک مرتبہ مڑ کر انھیں دیکھا اور
پھر رخ پھیر لیا۔

دانش نے شباہت سے کہا "براہ کرم آپ ڈاکٹر کا بیگ نیچے سے لے آئیے"

"جی بہت اچھا" وہ کمرے سے چلا گیا۔

کرنل صاحب نے ڈاکٹر فرانسس کو نشست پیش کی اور پھر نہایت خاموشی سے
عنبر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔ آپ کا مریض۔ میں نہیں جانتا کہ بیرسٹر صاحب نے آپ سے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟"

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر خاصی بلند آواز میں جواب دیا "مطمئن رہئے۔ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔"

کرنل صاحب خاموش ہو گئے۔ دانش تفصیلی ہسٹری راستے میں بیان کر چکے تھے۔ شباہت ڈاکٹر صاحب کا بیگ لے آیا۔ غالباً اس نے راستے میں ملنے والے کسی ملازم کو چائے کا آرڈر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے کمرے میں آنے کے بعد اندر سے چائے اور اس کے لوازمات بھی آ گئے۔

"آیئے مسٹر معاذ... پلیز! ہمارے لیے کافی بنایئے" ڈاکٹر فرانسس نے عبیر سے کہا "کھانا پینا مجھے زہر لگتا ہے" عبیر نے ان کی طرف دیکھا۔ آگے بڑھا اور ٹرے کو دفعتہً یوں الٹ دیا کہ تمام برتن چائے اور بسکٹ وغیرہ فرش پر بکھر گئے۔

"مجھے معلوم ہے۔ تم ظالم اور جلاد ہو" وہ قہر آلود آواز میں چنگھاڑ کر اور دانش کی طرف مڑ کر بولا "تم۔ دیوار ہو۔ میرے اور اس کے درمیان۔ جسے میں چاہتا ہوں۔ میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا... تمھارا۔ تمھارا۔ سب کا" اس نے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ شباہت کا دل رو رہا تھا۔ وہ خاموش تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دانش پر دفعتہً منکشف ہوا کہ ان کے انکاری خط کے لکھنے کے بعد یہ حشر اٹھا تھا۔ وہ جو بن کر رہ گئے۔ ڈاکٹر فرانسس بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ کرنل صاحب نے ان کے پاس جھک کر سرگوشی کی۔ "آپ کا کیا خیال ہے... کسی قسم کی جنسی الجھن کا ردعمل ہے؟"

"بالکل نہیں... دماغی الجھن" انھوں نے کہا اور سگار سلگایا۔ شباہت بیچارہ

جھک کر لرزتے ہاتھوں سے سب کچھ اٹھا رہا تھا۔ عبیر بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

"ہوں" عبیر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ لیکن اپنائیت شناسائی اور واقفیت کا ان میں شائبہ بھی نہیں تھا۔

"تم بھی نہیں جانتے اس کا نام....." عبیر نے رازداری سے سرگوشی کی "جو بارات کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ میرے بھائی..... وہ بہت اچھی تھی۔ ایک حسین خواب سے بھی اچھی۔ اسے کہیں سے لے آؤ میرے پاس" پھر وہ اپنے پیچھے اشارہ کر کے مدھم لرزتی ہوئی آواز میں بولا "یہ جو موٹے موٹے آدمی تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو۔ یہ موت کے ہرکارے ہیں مجھے زبردستی قتل کر کے لے جائیں گے اپنے ساتھ۔ مجھے یقین ہے۔ کوئی نہ بچا سکے گا۔ کوئی بھی نہیں..... اور یہ موت کے فرشتے یہاں سے جائیں گے نہیں"

"موت کے فرشتے نہ کہو عبیر! اچھی طرح دیکھو۔ ان میں ایک تمہارے ڈیڈی ہیں۔ تم انہیں بھی نہیں پہچانتے؛ وہ تمہیں بے انتہا چاہتے ہیں۔ روتے ہیں تمہارے لیے۔ وہ ہرگز تمہیں موت کے منہ میں نہیں جانے دیں گے۔ ہاں ہاں ... سوچو اچھی طرح ... میں غلط تو نہیں کہتا"

"میری ماں کہاں ہے؟" اس نے چپکے سے پوچھا۔ شباہت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے پر مسرت لہجے میں کہا "تمہاری ماں اندر گھر میں ہیں۔ تم کب سے ان کے پاس نہیں گئے؟"

"پتہ نہیں" وہ سر جھکا کر پھر ایک ایک چیز ٹرے میں رکھنے لگا۔ اور بڑے مایوس لہجے میں کہا "کتنے برس گزر گئے۔ افسوس! مجھے تو اپنی ماں کا چہرہ بھی یاد نہیں آتا جب بھی ذہن میں ان کا چہرہ ترتیب دیتا ہوں۔ کہیں سے اتنے بہت سے پھول بھری سوچ کی یادیں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف خوشبو پھیل جاتی ہے اور ماں کا چہرہ

پھولوں کی آڑ میں چھپ جاتا ہے... کبھی تمہارے ساتھ ایسا حادثہ نہیں گزرا؟"

"بہت مرتبہ" شباہت نے دل ہی دل میں آنسو اتارتے ہوئے کہا "مگر تمہیں کیا بیماری ہے؟ تم اگر چاہو تو ابھی اور اسی وقت اندر چل کر ممی سے مل آؤ۔"

"نہیں ملیں گی۔ اتنی نفرت کرتی ہیں مجھ سے۔ سب نفرت کرتے ہیں" اس نے حسرت سے معمور لہجے میں کہا "کوئی بات تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ لوگ پاس سے گزر جاتے ہیں۔ اپنی شناسائی کی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں اور یہ خوشبو میرے حواسوں پر چھا جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کا ادراک ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور پھر میں پاگل ہونے لگتا ہوں۔ کیونکہ نہ وہ خوشبو پھر آتی ہے نہ اس سے وابستہ ہستی۔ ان خوشبوؤں ہی نے مجھے دیوانہ بنایا ہے... ورنہ میں ایسا تو نہ تھا۔"

شباہت تعجب سے اس کی باتیں سننے لگا۔ جن میں دیوانگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"اچھا عبیر اللہ۔ وہاں بیٹھو چل کر" شباہت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ جگہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے... مجھے اچھا نہیں لگتا۔" دفعتہً عبیر کے چہرے پر وحشت نظر آئی۔ برافروختہ ہو کر بولا "کیا تم اندھے ہو؟ دکھائی نہیں دیتا۔ میں کام کر رہا ہوں" اور یہ کہہ کر یوں دھاردار شیشے سمیٹے کہ اچانک ایک ٹکڑا اس کے انگوٹھے کو چیر گیا۔ یکبارگی عبیر کی آنکھوں میں کسی سنسنی خیز احساس کی تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے شباہت کے ہائیں ہائیں کرتے ایک مرتبہ اور وہی ٹکڑا اپنے زخم پر پھیر دیا۔ خون کا فوارہ سا چل گیا۔ جب تک شباہت اس کا ہاتھ تھامتا اس کا پورا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔

دانش نے اسے زبردستی اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ کرنل صاحب ایسے حواس باختہ تھے کہ انہیں کوئی تدبیر نہیں سوجھی جلدی سے اپنی قمیص کا دامن اس کے زخمی ہاتھ پر لپیٹ دیا۔ عبیر ہنس رہا تھا۔ کرنل صاحب شباہت کی طرف مڑے۔

اور پھولی ہوئی سانسوں میں بولے " میرے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس لے آؤ۔ جلدی کرو۔ خدانخواستہ شیشے کا کوئی ذرہ زخم میں رہ تو نہیں گیا" [illegible] باڈی بھاگا۔ عبیر کے قہقہوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔

کرنل صاحب ضعیف آدمی تھے۔ یوں بھی ان کی جسمانی توانائی روز بروز رو بہ انحطاط تھی۔ مستزاد وہ غم تھے جنھوں نے ان کی فولادی رگوں کو زنگ آلود کر کے جگہ جگہ سے شکستہ کر دیا تھا۔ وہ بڑے بھرم سے زندہ رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ درحقیقت زندہ لوگوں میں ان کا شمار نہ تھا۔ پچھلے چند برسوں میں جوان بیٹے کی بیماری نے انھیں بالکل کھوکھلا کر رکھا تھا۔ اور ان دنوں مسلسل محنت، بے خوابی اور گوناگوں پریشانیوں نے انھیں خود بھی بیمار کر دیا۔ بہت تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ جیسے ابھی دفعتہً گر پڑیں گے۔

اس وقت بڑی مشکل سے عبیر کے انگوٹھے کی ڈریسنگ کی۔ وہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے معمولی زخم کے بینڈیج کے لیے انھیں اسے زبردستی بے ہوش کرنا پڑا۔ وہ تنہا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ شرارت، دانستہ [illegible] شیطانی [illegible] نے ایسے جکڑ رکھا تھا کہ وہ کسی سے بھی تھاما نہ گیا۔ اندیشہ تھا کہ [illegible] مزید زخم نہ لگ جائیں۔ اسے کلوروفارم دیتے ہوئے کرنل صاحب [illegible] ہو رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ سفید ہوا تھا۔ پھر جب وہ بے ہوش ہو کر بے حس و حرکت پڑا رہ گیا تھا تب دیر تک اس کے چہرے کو تکتے رہے تھے۔

بالآخر جب خدا خدا کر کے اس کا زخم باندھا گیا تب وہ [illegible] کے قریب خود بھی بے ہوش ہو کر صوفے پر گر پڑے ... دانستہ [illegible] زد بخار میں لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا جناب ..... آپ بڑے بے موقع پڑے" دانش نے متفکر ہو کر کہا۔

"میاں میری فکر نہ کرو۔ دیکھو اس بدنصیب کو ہوش آیا کہ نہیں" وہ خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ پھر کہا "تم مجھ پر شال ڈال دو تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"آپ مسٹر عبیر کے پاس آ جائیے مسٹر شباہت" ڈاکٹر فرانسس نے کہا "انھیں ہوش آ رہا ہے" شباہت بجھا ہوا دل لیے ایک ڈھی کے مانند میز کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر عبیر نے آنکھیں کھول دیں۔ کسی قسم کی تکلیف ہی کا احساس تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا بندھا ہوا ہاتھ دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میز پر سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ شباہت نے اس کی پیشانی سے بال سمیٹتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا

"یہاں بے آرام لیٹے ہو عبیر۔ اٹھو اپنے بستر پر آرام سے لیٹ کر سونے کی کوشش کرو۔" اس نے شباہت کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی اور پھر واپس تکیے پر گر پڑا۔

"ابھی نہیں ... ابھی نہیں ... کہیں درد ہے۔ پتہ نہیں کہاں؟"

"کمرے میں ظہیر نے قدم رکھے۔ وہ متواتر اس قسم کے مناظر دیکھتے آ رہے تھے لہٰذا اب کسی غیر معمولی صورت حال کی ان کی نظروں میں زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ بڑی لاپروائی سے پوچھا "شباہت ... تمھارے نئے مہمان ڈاکٹر فرانسس کے لیے ڈنر کہاں بھیجا جائے؟ تم بڑی دیر سے اندر نہیں آئے۔ بڑی مدت کے انتظار کے بعد مجھے یہاں تک آنا پڑا ہے" وہ علانیہ دانش سے ناراض تھے۔ انکی دانست میں یہ سارا ہنگامہ ان کے خط کا پھیلایا ہوا تھا۔

اس کا سخت احساس دانش کو بھی تھا۔ مگر انھوں نے اُن سے معذرت نہیں طلب کی۔ مصیبت تو شباہت کی تھی۔ ایک طرف ظہیر کو سمجھا سمجھا کر ٹھنڈا کرتا تھا، دوسری طرف دانش کو یاد دلاتا تھا کہ ظہیر پر ان کے سلوک کا اثر نہیں ہے۔ ظہیر اس کا جواب سنے بغیر چلے گئے۔

"مجھے اجازت دو شباہت!" دانش نے کہا "میں پھر آؤں گا۔ اندر کسی سے کہلوا دو۔ غالباً وہ ابھی گئی نہ ہوں گی۔"

"کیسی باتیں آپ کرتے ہیں؛" شباہت نے کہا "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عین کھانے کے وقت آپ اور بھابھی چلے جائیں۔ آئیے! اس طرف کمرے میں۔ میں ابھی کھانا لاتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے" اچانک بڑی بے تکلفی سے ڈاکٹر فرانسس بول پڑے "پہلے کھانا ہو جائے۔ ہم اور مسٹر دانش کل آنے کی کوشش کریں گے۔ کرنل صاحب آپ آرام کیجیے۔"

وہ رات بہت تاریک تھی۔ چاند کی بالکل آخری تاریخیں تھیں۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ایک کروہ سناٹا سا فضا پر طاری تھا۔ کرنل صاحب کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ وہ ظہیر کو شباہت کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انھیں آرام سے سُلا کر جب وہ واپس مردانے میں جا رہا تھا تب اچانک نہ نشین کے پاس دو دُھندلائی ہیکلوں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"تم۔ لوگ۔۔۔؛" شباہت سر پر توقیر کو دیکھ کر ہکلایا "رات کے دس بجے ہیں۔ ابھی تک سوئے نہیں۔۔۔ کیا بات ہے؟"

ہم کب سوتے ہیں، کب جاگتے ہیں؛ اس کی آپ کو کیا خبر؛" توقیر

نے کہا۔ اس کے سیدھے سادے لہجے میں بھی طنز کی وہ تیزابیت
تھی جسے محسوس کر کے شباہت کے سارے جذبات جھلسنے لگے۔ اسے
احساس ہوا کہ اس نے توقیر کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ شادی کے بعد
ان پندرہ دنوں میں شب و روز کے ایک لمحے میں بھی اس سے نہ باتیں
کی تھیں، نہ اس کے پاس آیا تھا وہ تو اسے اپنی بیوی کی حیثیت
سے بھی فراموش کر چکا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اُسے اپنے جگری
دوست کی بدحالی نے حد سے زیادہ بے قرار و بدحواس کر رکھا تھا۔
لیکن ایسا بھی تغافل کیا۔ کہ وہ توقیر کو بھی فراموش کر گیا۔

ندامت و خجالت کا پسینہ اس کی پیشانی پر چمکنے لگا۔ وفورِ احساس
نے اُسے گونگا کر دیا۔ سریر البتہ دونوں کے احساسات و جذبات سے
بے خبر تھی۔ اس نے پوچھا " بتائیے شبّو بھیا! اب جبیر کی کیا حالت
ہے؛ آپ نے اندر آنا چھوڑ دیا۔ بھائی جان نے ہمیں باہر جانے
سے منع کر دیا۔ کچھ خبر نہیں ملتی کہ اُدھر کا کیا حال ہے؛"

شباہت ایک خوابِ گراں سے چونک پڑا۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا
اور آواز پر قابو پا کر بولا " کیا حال سناؤں؛ کل کوئی نئے ماہرِ نفسیات
آئیں گے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے"

" اللہ رحم کرے " سریر بولی۔ پھر توقیر کا ہاتھ تھام لیا " چلو چلیں
میرا سر خود بھی چکرا رہا ہے۔ ادھر بھائی جان بھی پڑ گئے۔ اور ظہیر
بھائی کو خواہ مخواہ غصّہ آ رہا ہے " اُس نے منہ بنا لیا۔

" سریر! تم کافی لے آؤ۔ کتنی مدت گزر گئی ہم نے ساتھ ساتھ نہ کھایا
نہ پیا " شباہت بولا۔

"ابھی لاتی ہوں۔ شاید بھائی جان کے لیے بنی ہو"۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی چل دی۔ شباہت نے جھک کر توقیر کا ہاتھ پکڑا۔ اور اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ توقیر بے چاری چپکے سے آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کے خلوص و محبت نے شباہت کی وفاشعاری اور جاں نثاری نے بہت کچھ تاوان لے لیا تھا۔ اب تو اس کے سینے میں پرشباب دل کے بجائے برف کا ٹکرا رکھا تھا۔

"توقیر! صبر کرو اور انتظار کرو ہمارے اچھے دن دور نہیں ہیں"

"کیا میں نے کسی بات کی شکایت کی ہے؟" توقیر نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو توقیر! مجھے تم پر فخر ہے" شباہت نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا "تم نے اپنی تمام امنگوں کا گلا گھونٹ دیا۔ یقیناً تمھارا صبر رنگ لائے گا۔ تمھاری آنکھوں سے وفا چھلکتی ہے۔ زبان محبت کے گیت گاتی ہے۔ دل تمھارا ایثار سے معمور ہے۔ توقیر! جو انسان اپنے نفس کو مغلوب کر لے وہ فرشتوں کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے"

"آپ میری کوئی فکر نہ کیجیے۔ میں ہر طرح اچھی ہوں۔ آپ اپنی فکر کیجیے۔ آپ ہی پر بچیا جان کی اور عنبر کی زندگیوں کا انحصار ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے تاکہ دونوں کی خدمت کے قابل ہو سکیں۔ کاش! میں بھی کچھ ہاتھ بٹا سکتی"

توقیر کے خیالات کی عظمت نے شباہت کو بہت متاثر کیا۔ نہ شکوہ، نہ شکایت۔ وہ الٹی اسے صحت مند رہنے کی تاکید کر رہی تھی کہ خدمت کر سکے۔ یقیناً اچھی تعلیم اور ماں کی اچھی تربیت توقیر

پر رائگاں نہیں گئی تھی۔

اتنے میں سریر چھوٹی سی سینی میں کافی کی تین پیالیاں رکھے آگئی۔

"آج دوپہر کو خالہ امی کا خط آیا تھا۔ آپ کو پتہ نہیں؟ شباہت بھائی! خالہ امی تو جدہ پہنچ گئیں" سریر نے کہا۔

"خدا مبارک کرے۔ اب حج میں بھی کم دن رہ گئے ہیں" شباہت نے کہا۔ اُن میں مختلف باتیں ہوئیں۔ پھر شباہت ان دونوں کو زنانہ ڈیوڑھی تک پہنچا کر واپس ہوا۔

"شب بخیر!" اُس نے بہت چپکے سے کہا۔

"شب بخیر!" ایک سسکی سی تویر کے لبوں پر مچل گئی۔

جب شباہت اپنے کمرے میں آیا تو خبیر کو بدستور سوتا ہوا دیکھا تھوڑی دیر وہ اپنے پلنگ پر بیٹھا رہا اور نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اس نے تکیے پر نیم دراز ہو کر ایک پرچہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے کئی راتوں کی بے خوابی کے بعد نیند آہی گئی۔ پرچہ ہاتھوں سے چھوٹ کر سینے پر گرا اور وہ بے خبر سو گیا۔

کھٹکے سے خبیر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اور نہ جانے کیا سوچ کر ہانپنے لگا۔ شباہت گہری نیند میں گم تھا۔ خبیر بستر سے اُترا اور چپکے سے دروازے تک آیا۔ نرسنگ آرڈرلی دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر دیوار کے سہارے ٹکا ہوا تھا۔ نیند میں وہ بھی غافل تھا۔ خبیر نے بڑی آہستگی

سے دروازہ کھولا اور اسی طرح بند کردیا۔ اور جھپٹ کر باغ کے
زینوں پر ہو رہا۔ زینے عبور کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔
کیوں کہ دریدہ چادر ابر سے چاند نے اپنا زرد زرد چہرہ نکال کر
اندھیری کائنات کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ باغبان نے باغ
میں غالباً نئے درخت لگانے کے لیے بڑا بڑا کیاریاں بنا دی تھیں
ان میں کبھی گرا کبھی اٹھا۔ ایک تیز اور بلا خیز آندھی اس کے
ذہن میں چل رہی تھی۔ رہ رہ کر وہ مٹھی بند کرتا اور کھولتا اور
اس زخم کو محسوس کرتا جو اسے اب بھی تکلیف پہنچا رہا تھا۔ اس
کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ وہ خون یاد آیا جو زخم سے نکل کر
اس کے سارے ہاتھ کو نہلا گیا تھا۔ لہو کا غسل۔ اس نے دانت پر
دانت جکڑ لیے۔ اور اس شدت سے مٹھی بند کی کہ زخم سے پھر خون
ابلا اور سفید سفید پٹی پر چھلک آیا۔ ذہنی ظلمت میں دھندلی سی
ایک شعاعِ احساس ... جانے جنون اور دیوانگی کی کون سی گرہ
شعور کی راہ میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

آپریشن ... آپریشن ... اس کے بغیر میں اچھا نہ ہو سکوں گا ...
ہانپتے ہوئے اس نے سوچا اور ایک درخت کے تنے سے لگ کر لمبی
لمبی سانسیں لینے لگا۔

سناٹے میں خیالوں کے بوتے اس کی ذات کے اندر باہر چکرا رہے
تھے، قہقہے لگا رہے تھے، چیخ رہے تھے۔

کون ہے۔ جسے آخری بار گلے لگاؤں؟
میرے اپنے پرائے ... " گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے ابلنے

لگے۔ مگر وہ اپنے گریہ سے بے خبر تھا۔ اب تو سسکیوں سے رو رہا تھا۔

"اے بے رحم سنگدل زندگی!"

"اب میری موت پر تالیاں بجا۔"

"تو یہی چاہتی تھی۔ زندگی کی روشن راہوں سے بھٹک کر
میں تیری سرد و تاریک آغوش میں چلا آؤں۔

"لے اے موت! اے بیدرد ظالم غیر محسوس پیکر! میں تیرا
دامن تھام رہا ہوں۔

"اے زندگی! تیرا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔"

کچھ دیر یونہی کھڑا روتا رہا۔ جب آنسو تھم گئے۔ سانسیں
درست ہوگئیں۔ پھیکی سی کہنہ چاندنی تاریک درختوں پر چپکے
چپکے چھٹکنے لگی اور سامنے کی راہ واضح ہوئی تو اس نے پھر قدم
بڑھایا۔ اندھیرے میں مدھم طور پر کرنل صاحب کی لیبورٹری دکھائی
دے رہی تھی۔ خبیر کا رخ اسی طرف تھا۔ کبھی تیز قدم رکھتا،
کبھی چھوٹے چھوٹے پودے پھلانگتا وہ لیبورٹری کے قریب پہنچ گیا۔
عمارت کے کیاری ڈنڈ کے گرد کراٹا کی چار دیواری سی کھنچی تھی۔ اس
کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ جسے عبور کرتے کوئی دشواری ہوتی
کیاری ڈنڈ سے گزر کر وہ دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ کئی
بار کی کوشش نے بھی اسے کامیاب نہ کیا کہ وہ قفل کھولتا۔ ادھر
سے مایوس ہو کر پشت پر پہنچا۔ روشن دان دروازے کے اوپر
خوشنمائی کے لیے بنائے گئے تھے۔ اس نے گھونسہ مار کر شیشہ توڑا اور
اندر کا بولٹ کھول دیا۔ کمرے میں جاتے کیا دیر لگتی۔ اس نے اندر

پہنچ کر بجلی جلائی۔ اور اس کی تیز روشنی میں ان خوفناک اوزاروں
کو گھورنے لگا جو ایک میز پر قرینے سے سجے تھے۔ ان میں تیز چاقو قینچیاں
اور بڑے بڑے ہڈی کاٹنے والے دھاردار چھرے بھی تھے۔ جن کا نظارہ
بدن میں لرزہ ڈال رہا تھا۔

اپنے گردوپیش پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے پھر اپنی مٹھی بند کی۔
پھر اس اذیت کا احساس کیا جو سارے جسم میں ٹیس بن کر ٹپکنے لگی تھی
اور پھر اُن چمکدار خوفناک اوزاروں کو دیکھنے لگا۔

عمارت کے باہر اندھیری رات سنسنا رہی تھی۔ ساری کائنات
پر سناٹا مسلط تھا۔ حتیٰ کہ وہ حشرات الارض بھی خاموش تھے جو رات
کی خاموشی میں اپنی کرخت و تلخ آوازوں سے نیندیں حرام کرتے ہیں۔

پھر نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا ایک ننھا سا پردار کیڑا آیا اور
بلب کے اطراف چکرانے لگا۔ جبیر نے چونک کر سر اٹھایا اور پروانے
کو دیکھا اور دفعتاً آگے بڑھ کر ایک تیز دھاردار چاقو اپنی مٹھی میں
جکڑ لیا۔

اور اچانک اسے محسوس ہوا جیسے دور کوئی اس کا نام لے کر
پکار رہا تھا۔

"جبیر... جبیر... !"

"شاید یہی میرا نام ہے۔" اس نے سوچا... اوہ۔ وہ آپہنچے۔
اس نے دروازے کے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کی ناکام
کوشش کی۔ اور اوزار مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"جبیر... جبیر بھائی... کہاں ہو... ؟ خدا کے لئے آگے قدم نہ

بڑھانا۔ جہاں کہیں ہو وہیں ٹھہرے رہو" نہ جانے کون باغ کے ویرانوں میں چیخ رہا تھا۔

اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ بکھری...
"کب تک اسی جگہ کھڑا رہوں گا جہاں تقدیر نے کھڑا کر دیا ہے"

"نعیر... ! نعیر... !! جواب دو۔ کہاں ہو ؟"

آوازیں قریب سے قریب تر ہونے لگیں۔ خطرہ سر پر آپہنچا تھا۔ ایک سرد سنسنی اس کے رگ و پے میں پھیلنے لگی۔ اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ جلدی، فوراً ۔ ابھی اور اسی وقت ۔

اس نے عمارت کے بالکل قریب قدموں کی گونج اور آوازوں کا شور سنا... ایک نظر دروازے پر ڈالی۔ اور پھر اس کا وہ ہاتھ جس میں اوزار تھا، اپنی کنپٹی کی جانب چلا۔ کنپٹی سے خون کا فوارہ سا چھوٹا۔ ہاتھ سے جاقو گرا۔ ایک ہلکی سی کراہ اس کے لبوں سے نکلی اور وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے شہتیر کی طرح دھم سے فرش پر گر پڑا۔

ٹھیک اسی وقت شباہت، نعیر، نرس اور چوکیدار چیختے چلاتے اندر داخل ہوئے۔

"نعیر... !" ایک بھیانک چیخ شباہت کے منہ سے نکلی اور وہ جھپٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

نعیر بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کنپٹی سے خون بہہ بہہ کر فرش کو سرخ کر رہا تھا۔ شباہت کے رونے کی آواز کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا۔ شباہت نے اس کے لبوں پر لب رکھ دیے اور زار و قطار روتا ہوا بولا "نعیر! میرے بھائی۔ کیا تمہارا یہی انجام تھا ؟"

ظہیر کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا کرنا چاہیے۔ بدحواس ہو ہو کر ایک ایک کی صورت تک رہے تھے۔ ان کی طاقت گویائی بند ہو کر رہ گئی تھی۔

نرسنگ آرڈرلی کے نزدیک ایسے واقعات غیر معمولی اور پریشان کن نہیں تھے۔ وہ تو شب و روز موت و حیات کے کھیل دیکھتا رہتا تھا۔ اسی نے ظہیر کو ہوش دلایا" صاحب! آپ دیکھ کیا رہے ہیں، اٹھائیے نذیر کو لٹائیے۔ جتنا زیادہ خون بہے گا اتنا نقصان ہوگا۔ ابھی وقت ہے۔ پھر کچھ بنائے نہ بنے گا....."

چنانچہ ظہیر اور اردلی نے بصد مشکل نذیر کو فرش سے اٹھا کر آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا۔ اردلی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کوئی دوا نکالی اسے زخم پر لگا کر بہت سی نرم روئی سے زخم کا منہ بند کر دیا۔

" صاحب! آپ فوراً جائیے۔ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دیجئے۔ میں اپنے پہچان والے ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں" اس نے کہا، آپریشن کرکے زخم میں ٹانکے لگا دیئے جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چنانچہ شباہت تو کرنل صاحب کو اطلاع دینے کے لیے بھاگا۔ ظہیر اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگے اور اردلی ڈاکٹروں کو ٹیلی فون کرنے لگا۔

شباہت نہ جانے کس طرح اندھا ہو کر بھاگ رہا تھا اسے یہ تو یہی احساس تھا کہ نذیر اسی کی غفلت نے یہ دن دکھایا۔ نہ جانے نذیر کے ذہن میں خودکشی کا خیال کب سے پرورش پا رہا تھا۔ ذلت اور موقعہ کی آسانی نے اسے کامیاب کر دیا۔

"میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اس نے بے قرار ہو کر سوچا" میں جبیر کے پیچھے ہی دوسری دنیا میں بھی پہنچوں گا۔۔۔۔ میں جبیر کا قاتل ہوں۔ نہ میری آنکھ لگتی، نہ میں اس کی نگرانی سے غافل ہوتا، نہ یہ نوبت آتی۔"

کوٹھی میں تقریباً سب جاگ اٹھے تھے۔ اور ایک بدحواس ہلچل بچی ہوئی تھی۔ کرنل صاحب اپنی شال لپیٹ کر باہر آگئے تھے۔ تمینہ بیگم ساری جان سے کانپ رہی تھیں اور ایک ایک سے گڑبڑ کی وجہ پوچھ رہی تھیں۔ سریر اور توقیر متوحش تھیں۔

انھیں بخوبی اندازہ تھا۔ اس ہلچل کی وجہ ضرور بڑی ہے۔

پھر شباہت کی وحشت زدہ شکل پر نظر پڑی اور آن واحد میں ان سب کے چہرے یرقان کے بیمار کی طرح زرد ہو گئے۔

"چچا جان ۔۔۔!" وہ یکبارگی گھٹنوں کے بل گرا اور کرنل صاحب کی مرتعش ٹانگوں سے چمٹ گیا۔۔۔ "چلیے! جلدی چلیے!!۔۔۔ معلوم نہیں ۔۔۔ اب میرا جبیر کیسا ہے؟"

اس نے آنسوؤں کی زبان میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔

پھر انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کس طرح تمینہ بیگم بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ سریر و توقیر چیخنے لگیں۔ کرنل صاحب کا کیا حال ہوا؟ انھوں نے کندھوں پر سے شال جھٹک دی۔ اور دونوں آگے پیچھے گھر سے دوڑ پڑے۔

رات کے تقریباً تین بجنے والے تھے جب کئی ڈاکٹروں کی گاڑیاں کمپاؤنڈ میں رکیں۔

کرنل صاحب نے آپریشن ختم کیا۔ چھن چھن کرتے اوزار طشت میں گرے۔ اور دوسرے ڈاکٹروں نے الگ ہٹتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا۔

"بے چارے کرنل صاحب۔۔۔!"

"آپ کا کیا خیال ہے؛ کیا زخم اندر اندر جڑ جائیں گے؟" شباہت نے پوچھا۔ اس کی حالت مُردوں سے بد تر تھی۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا ہاتھ پاؤں یخ کے مانند سرد ہو گئے تھے۔ دل حلق میں، دھڑک رہا تھا۔

"یقیناً جناب؛" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کب تک ہوش آجائے گا؛" اس نے ایک آنسو بھری نظر عبیر پر ڈال کر پھر پوچھا۔

"آجائے گا۔ آجائے گا۔۔۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا" دوسرے نے کہا۔ مگر وہ اپنی پیشنگوئی پر متاسف تھا۔ شاید بیمار بے ہوشی کی حالت میں چل بسے۔ ویسے ان تمام ڈاکٹروں کو یقین تھا، عبیر نہیں بچ سکتا۔

کرنل صاحب اپنی بیماری بھول گئے تھے خاموش کھڑے سوچ رہے تھے کہ ایک بار انھوں نے گھبرا کر خدا سے دعا کی تھی کہ وہ عبیر کو اس دنیا سے اٹھالے۔

کیا مقبولیت کی گھڑی آپہنچی تھی؛ کیا وہ جا رہا تھا دنیا سے؛۔ لیکن وہ تمام دعائیں جو انھوں نے اس کی صحت و سلامتی کی مانگی تھیں

وہ کہاں گئیں؟

"کرنل صاحب!... آپ اس صوفے پر لیٹ جائیے" ڈاکٹر شوکت نے کہا "آپ کو بخار ہے"

مگر انھوں نے نفی میں ہاتھ ہلایا "مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں اچھا ہوں۔ مگر میرا معاذ!" وہ یک بیک بے تاب ہو گئے اور فرش پر گر کر عبیر کی پٹی پر سر رکھ دیا۔

"عبیر تم سے یہ امید نہیں تھی"

"اے خدا! میری زندگی اب دنیا میں کس کام کی ہے۔ اسے قبول کر لے۔

"مگر میرے عبیر نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔

"اسے لوٹا دے، پھیر دے اسے موت سے زندگی کی طرف۔ اے اللہ! اے اللہ!!"

"کرنل صاحب دل کو سنبھالیے" ڈاکٹر شیام نے کہا اور انھیں فرش سے اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ پھر بڑے اخلاق و ہمدردی سے بولے "اگر آپ اتنے بے ضبط ہو جائیں گے تو ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا ہم تو آپ ہی کی ہدایتوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں"

"اے پروردگار!! آج میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے سر پر چھریاں چلائیں" کرنل صاحب نے کہا "وہ بہت بیقرار تھے۔ شاید وہی اندیشہ ان کی بیقراری کا باعث تھا جو دوسرے ڈاکٹروں کے دل میں جاگزیں تھا۔

کمرے کی خاموشی صرف شباہت کی سسکیوں اور کراہوں

سے مجروح ہو رہی تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ باغ میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ مسجد سے اذان کی روح پرور آواز بلند ہونے لگی۔ مگر اس کمرے میں موت کا سرد و ساکت سناٹا منجمد تھا۔ خبیر جوں کا توں بے ہوش اور بے حس و حرکت اپنے بستر پر پڑا تھا۔ سر کے اطراف پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ سینے پر سانسوں کی آمد و رفت کا ہلکا سا زیر و بم زندگی کا پتہ دے رہا تھا۔ ویسے وہ گہری بے ہوشی میں بالکل غافل پڑا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ انھیں چند دن کے لیے ہسپتال میں شفٹ کر دیجئے۔" ڈاکٹر سید نے کہا "یہاں وہ ممکن دیکھ بھال نہ ہو سکے گی جو نرسنگ ہوم میں بہت اچھی طرح ہو سکتی ہے۔"

"اب تو جو بھی ہوگا سید صاحب! وہ میری آنکھوں کے سامنے ہوگا" کرنل صاحب بولے۔ پھر ظہیر کو دیکھ کر کہا "تم گھر جاؤ۔ عورتوں کا معلوم نہیں کیا حال ہے۔ یہ سارا قصہ ان سب سے کہہ دینا اور یہ بھی تاکید کر دینا کہ ہر وقت کسی نئے سانحے کے لیے دل ہمیشہ مضبوط رکھیں۔"

ظہیر خاموشی سے نکل کر چلے گئے۔ شباہت خبیر کے پائنتی بڑھتے ہوئے اسٹول پر آ بیٹھا۔ ڈاکٹروں کا فی الحال کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے اور کمرے میں پھر ناگوار اور اعصاب پر اثر انداز ہونے والا سناٹا چھا گیا۔

پھر صبح کی چہل پہل شروع ہوئی۔ سوگوار، اداس، گریہ خیز۔ مگر تھی کہ اس کی آمد آمد سے دلوں میں نئی امنگیں نئے ولولے نہیں

بیدار ہوئے۔ بلکہ نت نئے خدشوں نے دلوں میں گھر کر لیا۔ کرنل صاحب اور شباہت ایک انداز اور ایک پہلو پر بیٹھے نہ جانے کیا سوچے جا رہے تھے؟

ظہیر زنانے گھر میں کیا پہنچے گویا کسی کے پیے پروانۂ موت لے کے پہنچے ہوں۔ ان کی شکل پر نظر پڑی تھی کہ سب کے سب بلند آواز میں رونے لگے۔ تہمینہ بیگم مردے کی طرح لیٹی تھیں۔ سطوت جہاں، سریر، توقیر اور بچے اور ملازم سب ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔

بمشکل تمام آواز اُبھار کر ظہیر نے کہا "سریر، توقیر! یہ کیا بدشگونی ہے۔ کیا تم لوگ خبیر کا صرف بُرا ہی انجام چاہتے ہو؟ اچھائی کی طرف تمہارا دھیان ہی نہیں جاتا۔ تمہیں تو پتہ ہے ان کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ بیمار تو تھے ہی۔ بس آج یہی دھن سمائی۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ــــ"

"مگر وہ زخمی کیسے ہو گئے ظہیر بھیا؟" توقیر نے پوچھا۔

"شیشہ توڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ٹوٹا اور اس کا ایک ٹکڑا ان کی پیشانی پر اس زور سے آکر لگا کہ ساری پیشانی لہولہان ہو گئی۔"

ظہیر نے سفید جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس کے سوا اور کیا کہتے کہ خبیر کی زندگی سے ہاتھ دھو لینا چاہیئے۔ دل ہی دل میں کانپ رہے تھے۔ پھر کچھ رک کر اپنے جھوٹ کا سلسلہ پھر شروع کیا "بھائی صاحب نے زخم سے کرچیں نکال کر ٹانکے لگا دیے ہیں۔ خدا کے فضل سے اب وہ آرام سے سو رہے ہیں۔"

ان کا دل بیٹھنے لگا۔ نہ جانے کب؟ کون؟ کس طرح؟ آکر اچانک

کوئی بُری خبر سُنا دے۔ یا خدا ہم سب لوگوں کے حال پر رحم کر۔ ان کے سینے میں آنسوؤں کے سمندر اکٹھا ہونے لگے۔ ایک دھندلی نظر تمیز جانا تمینہ بیگم پر ڈالی۔ اور دالان سے نکل کر برآمدے میں اُکھڑے ہوئے۔ اور دور نگاہیں گاڑ دیں، جہاں تجربہ گاہ کی عمارت دھوپ میں چمک رہی تھی، جہاں ایک کمرے میں عبیر موت و حیات کی جاں گسل کشمکش میں گرفتار تھا۔

ان کے رُکے ہوئے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔۔۔۔ دن کے آٹھ بجنے والے تھے۔ ملازم نے ڈاکٹر فرانسس کی آمد کی خبر سُنائی۔ ظہیر نے جلدی جلدی رومال سے آنکھیں پونچھیں اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولے

"اچھا شکور! تم انہیں بٹھاؤ۔ اور جلدی سے جا کر بڑے سرکار کو اطلاع دے دو۔ میں بھی آتا ہوں۔"

ملازم نے فوراً واپس آکر ظہیر کا پیغام دیا "صاحب! آپ کو اور ڈاکٹر صاحب کو بڑے سرکار نے وہیں بُلایا ہے اور کہا ہے کہ فوراً آئیے۔"

ڈاکٹر فرانسس ظہیر کو دیکھ کر بڑی خوش مزاجی سے مُسکرائے۔ اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ظہیر کے چہرے پر گہری اداسی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔

"کوئی خاص بات مسٹر ظہیر۔۔۔؟" انھوں نے پوچھا "کوئی نئی ہسٹری ہمارے مریض معاذ کی؟۔۔۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے جناب!" ظہیر نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی جلدی اور بہت مختصر مگر ضروری باتیں سُنا دیں۔ پھر بولے "آپ کو بھائی صاحب نے لیبوریٹری میں طلب کیا ہے۔ براہِ مہربانی میرے ساتھ

وہیں چلئے ؟

"آیئے !"

راستے بھر ڈاکٹر فرانسس واقعے کی تفصیل پوچھتے گئے اور ظہیر اختصار سے جواب دیتے گئے۔ عمارت کے دروازے پر کرنل صاحب نے ان کی تقدیم کی۔ اور رسمی علیک سلیک کے بعد دونوں اندر چلے گئے۔ ڈاکٹر فرانسس آگے بڑھ کر عنبر پر جھک گئے۔ کرنل صاحب نے شباہت کے کندھے پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا "اب تم گھر جاؤ۔ کچھ کھا پی لو۔ میرے بچے... خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اچھا کرتا ہے۔ اپنے بندوں کا دشمن نہیں ہے۔ رات سے تم پریشان ہوتے رہے ہو"

"چچا جان !" بے چارے کے لب پھر کانپنے لگے۔ "عنبر بے ہوش پڑا ہے۔ میرے حلق سے کھانا کس طرح اُترے گا ؟"

"بیٹا ! وہ ضروری چیز ہے۔ اتنی تو تمھاری طاقت برقرار رہے کہ تم اپنے عنبر کی خدمت کر سکو۔ اور ہاں... کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہمارے لیے بھی بھجوا دینا۔ میں بھی کھاؤں گا۔"

وہ سر جھکا کر چل پڑا۔ کرنل صاحب نے دروازہ بولٹ کر دیا اور تھکن کی گہری آہ بھر کر فرانسس کے پاس آ بیٹھے۔

"میں اندازہ لگا رہا ہوں مسٹر اختر!" انھوں نے پرخیال انداز میں کہا "اگر صحیح خطوط پر مسٹر ممتاز کا علاج کیا جاتا تو مرض ناقابلِ گرفت نہیں تھا... وہ صرف اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے۔ کسی صدمے نے ان کے ذہن پر اس قدر ناگوار اثر ڈالا کہ یک بیک اور آناً فاناً ان کا حافظہ فیل ہو گیا۔ جس طرح ہارٹ فیلیور ہے۔ آپ سمجھتے ہیں ؟"

"یہ بھی ذہن میں رکھیئے کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں" کرنل صاحب نے کہا "بے شمار اور ان گنت ڈاکٹروں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی ہے ... کیا میرے علاوہ کوئی دوسرا اپنے فن میں کامل نہیں تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ... مسٹر اختر!" انھوں نے کہا "یادداشت کی واپسی ایک مناسب تحریک اور نہج کی متلاشی ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے کیس جو ماہرین فن کی شب و روز کی عرق ریزی کے بعد بھی حل نہ ہو سکے وہ بالکل معمولی اور غیر اہم نہج کے ملتے ہی خود بخود یوں حل ہو گئے کہ عقل حیران رہ گئی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی ہوں۔ لیکن کرنل! ایک ڈاکٹر اور ایک نفسیات داں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انسانی جسم کی چاردیواری ہی تک پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ لیکن نفسیات داں اس چاردیواری کے اندر بھی جھانکتا ہے اور دیکھ لیتا ہے کہ وہ جس چیز کا متلاشی ہے وہ اس بند گھر کے کون سے اندھیرے کمرے میں پوشیدہ ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب!..." کرنل صاحب نے تسلیم کیا "تو پھر براہ مہربانی اس روح کے خلا میں بھی جھانکیے۔ جہاں اندھیرے میں آپ کے بیمار کی زندگی ٹھوکریں کھا رہی ہے ... میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں گا۔ میں سمجھوں گا خدا کے بعد اگر میرے بچے کو کسی نے زندگی دی ہے تو آپ نے ... صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا ہے مسٹر فرانسس۔ مگر ہنوز نہ دوائیں با اثر ہیں نہ دعائیں ....."

"کوئی پروا نہ کیجیے۔ کرنل! میں پوری کوشش کروں گا" فرانسس نے کہا۔ اتنے میں دروازے پر ملازم نے آواز دی "حضور! ناشتہ

لایا ہوں" کرنل صاحب نے دروازہ کھول دیا اور ملازم کو اندر آنے کی اجازت دیے بغیر سینی خود لے لی۔ ملازم کے پیچھے سریز دکھائی دی۔ رو رو کر چہرہ متورم ہو رہا تھا۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی "بھائی جان ایک نظر میں خیبر کو دیکھ لوں... تو تیر بھی آ رہی ہے"

"ابھی نہیں میری بیٹی!" انھوں نے چمکار کر کہا "ذرا ہم لوگ ناشتہ کر لیں۔ پھر میں خود وہاں آ کر تمھیں لاؤں گا اور خیبر کو دکھا دیں گے.." سریز کا چہرہ بجھ گیا۔ ڈری ہوئی آواز میں پوچھا "خیبر اچھے تو ہیں بھائی جان؟"

"بالکل۔ سریز... وہ آرام سے سو رہے ہیں۔ تم اس کی ماں سے بھی کہہ دینا پریشان نہ ہوں" پھر سریز واپسی کے لیے پلٹ گئی تو انھوں نے سینی اندر میز پر رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیا۔

وہ دونوں ناشتہ کرتے رہے اور خیبر ہی کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

"اس سلسلے میں ہپناٹزم بھی کارگر علاج ہو سکتا ہے" مسٹر فرانسس نے کہا "میں نے اکثر مریضوں پر اسے بھی آزمایا ہے۔ لیکن وہ کیس یادداشت وغیرہ کے نہیں تھے۔ بلکہ ——"

"میں نے آپ سے عرض کیا جناب والا! جو طریقہ عمل آپ مناسب سمجھیں۔ مگر پہلے وہ ذرا اس قابل تو ہو سکے کہ علاج کا متحمل ہو۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا"

"ایک مرتبہ بھی ہوش نہیں آیا؟" ڈاکٹر فرانسس نے پوچھا "جی نہیں... وہ تک رگیں اندر ہی کٹ گئی ہیں" کرنل صاحب

نے کہا "معلوم نہیں اس پر کیا گزر رہی ہے ۔ میں تو بالکل نا امید ہوں۔
ڈاکٹر صاحب! ویسے کوئی معجزہ ہو جائے تو ہو جائے"

"مگر مجھے امید ہے کہ وہ ہر طرح صحت یاب ہو جائیں گے۔ ان کا
ذمہ میں نے لیا ہے۔ اس سلسلے میں میں چاہتا ہوں کہ مسٹر معاذ کی زندگی
کی ایک ایک تفصیل مجھے بلا کم و کاست بتا دی جائے۔ وہ ان سے
واقعات بھی جنہوں نے اپنا سخت ترین رد عمل چھوڑا ہے... نفسیاتی
مرض کا ایک پس منظر ضرور ہوتا ہے کرنل صاحب! جس پر روشنی ڈالنا
بہت کار آمد ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے مرض کی جڑیں ماضی بعید
کے کسی واقعے سے مربوط ہوتی ہیں۔ جنہیں کریدا گیا تو اصل وجہ معلوم ہو
گئی۔ لہٰذا آپ کو اگر مجھ پر بھروسہ ہے یا یہ امر آپ کے لیے قابل یقین
ہے کہ میں اپنے طور پر اس کیس کو ہاتھ میں لے سکتا ہوں تو مجھ سے وہ تمام
باتیں کہہ دیجئے جو معاذ صاحب سے متعلق ہیں۔ تاکہ میں انہیں اگر دہراؤں
تو کہیں ٹھوکر نہ کھاؤں۔ یا کوئی غلط بیانی مجھ سے نہ ہو۔ آپ سمجھتے ہیں
نا... ڈاکٹر یا کسی بھی معالج سے رازداری کے معنی ہیں کہ مریض سے
دوستانہ بہتر سلوک نہیں کیا... ایک بھی تھا وہ آپ نے سنا ہوگا
کہ دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جا سکتا"

"میں اچھی طرح آپ کا مطلب سمجھ گیا" کرنل صاحب نے کہا
اور کچھ کہتے کہتے رک گئے پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی تصویر اٹھا کر دور
کہیں میز پر رکھ دی اور ڈاکٹر کے پاس آ بیٹھے اور بہت گہری سانس
لے کر کہا "جو کچھ آپ نے فرمایا۔ وہ... بے شک" اور پھر جھجکا کر
خاموش ہو گئے۔

کرنل صاحب خاموش تھے۔ جیسے وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا تھے
اور کسی ایک فیصلے پر پہنچنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

"ماضی کی ایک تفصیل... چاہے وہ خوشگوار ہو یا ناخوشگوار"
کرنل صاحب نے سر اٹھایا اور پر اعتماد لہجے میں کہا "جہاں تک معاذ
کے ماضی کا سوال ہے وہ بالکل بے داغ ہے۔ [illegible] اور انتہا
سے زیادہ خوشگوار۔ میں تو اپنے ماضی کے بارے میں سوچنے لگا تھا
مسٹر فرانسس! کہ اس کا بھی کچھ تعلق معاذ کی زندگی سے ہے یا وہ محض
بیکار ہے"

"مجھے آپ کا پورا تعاون درکار ہے مسٹر اختر" فرانسس نے کہا۔ کرنل
صاحب نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پست [illegible] میں کہا:۔
"میرے ماضی سے میرے بچے کا تعلق بس اتنا ہی ہے کہ معاذ میرا
حقیقی بیٹا نہیں ہے"

"اچھا؟" ایک سرسری نظر فرانسس نے کرنل صاحب پر ڈالی
اور صوفے کی پشت گاہ سے ٹک گئے۔

"وہ میرے دوست کا بچہ ہے" کرنل صاحب نے نہایت مدھم
آواز میں کہا "میرے اور معاذ کے باپ میں [illegible] مراسم تھے۔
محمد سرفراز ان کا نام تھا۔ وہ الہ آباد کے رئیس تھے۔ خاصے
خوشحال اور دولت مند تھے۔ مگر کسی دشمن کی ریشہ دوانیوں نے
انھیں آہستہ آہستہ اس نوبت پر پہنچا دیا کہ وہ [illegible] سے بھاگ کر
میرے یہاں پناہ گزیں ہوئے۔ آبائی جائداد [illegible] تھی۔ اثاثہ نام
کا ایک حبہ بھی ان کے پاس نہ رہا تھا... جب وہ اور ان کی بیوی

بڑے دل شکستہ اور خستہ حال میرے پاس آئے تب میں نے انھیں محسوس
نہ ہونے دیا کہ وہ اپنی پچھلی شان و شوکت کھو چکے ہیں۔ لیکن ان کی
بیوی کے دل پر اپنی تباہی کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان دنوں وہ حاملہ تھیں۔
معاذ کی پیدائش کے تقریباً دو ماہ بعد وہ ختم ہو گئیں۔ ظہیر جو معاذ کا حقیقی
بڑا بھائی ہے۔ اس زمانے میں بمشکل ڈھائی تین سال کا رہا ہوگا۔ سرفراز
ایسے دل برداشتہ اور بیزار تھے کہ دونوں بچوں کو میری بیوی کے سپرد کر کے
اپنے وطن واپس چلے گئے۔ شاید اپنے عزیزوں میں سے کسی ایسے عزیز
کی تلاش میں گئے تھے جو اُن کے بچوں کا کفیل ہو سکتا۔ مگر ان کے وطن
جانے کے لگ بھگ چھ ماہ بعد میں نے سنا کہ انھیں کسی نے مار ڈالا ۔۔۔ یہ
کہانی اس طرح ختم ہوئی اور دونوں بچے میرے پاس رہ گئے۔ میں لاولد
تھا۔ میری بیوی کو اولاد کی تمنا گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ ایسے میں
اچانک نعمت غیر مترقبہ مل گئی ۔۔۔ ہم نے دونوں بچوں کو کبھی نہیں بتایا
کہ ہم ان کے والدین نہیں ہیں۔ کوئی دس سال قبل ایک صاحب ظہیر
کے غالباً ماموں انھیں ملے تھے۔ معلوم نہیں، کس طرح پتہ چلا تھا۔ انھوں
نے ساری تفصیل کم و بیش ظہیر کو سنا دی۔ وہ تب سے یقین و تشکیک
میں مبتلا تھے۔ لہٰذا ان سے سچی بات کہنی پڑی۔ مگر میں نے ظہیر کو
نہیں بتایا۔ ظہیر نے بھی نہیں کہا۔ اور میری استدعا ہے کہ آپ
بھی نہ کہیے گا۔ آپ نفسیات کے معلم ہیں۔ اندازہ آپ کو ہو گا کہ
یہ بہت نازک جذباتی رشتہ ہے جسے میں کسی قیمت پر توڑنا پسند
نہیں کرتا۔ یہ بھی مجھے گوارا نہیں ہے کہ اس راز کے جاننے کے
بعد مجھے اپنا حقیقی باپ نہ سمجھے۔ اس طرح میں شاید مر جاؤں گا مسٹر

فرانسس!"

"بے شک میں اچھی طرح سمجھتا ہوں" انھوں نے کہا "آپ ہر طرح مطمئن رہیے اور مجھ پر اعتماد کیجیے۔ اچھا اب آئیے اس حادثے کی طرف جس نے جیمس کے حواس پر اثر ڈالا ہے... مجھے ان کے تمام دوستوں اور ساتھیوں کے پتے دیجیے اور ان کے خاص خاص واقعات پر بھی روشنی ڈالیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"یہ ناممکن بھی ہے ڈاکٹر! میں تو بالکل نہیں جانتا۔ اس کے کتنے دوست تھے یا اب ہیں۔ میں تو صرف اسی بچے کو جانتا ہوں جسے آپ نے بھی جیمس کے پاس بیٹھے روتے دیکھا ہے۔"

"حادثے کی تفصیل..." فرانسس نے کہا۔ چنانچہ جو کچھ تفصیل کرنل صاحب کو معلوم تھی وہ انھوں نے من وعن کہہ دی۔

"نیت کا مسئلہ لاینحل ہے جناب" وہ دیر بعد مبہم انداز میں مسکرائے "خیر مجھے امید ہے کہ یسوع مسیح مجھے اپنا کام نہیں کرنے دیں گے... اچھا میں چلتا ہوں۔ ایک نہایت اہم چارٹ ترتیب دوں گا اور جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ بائی۔"

کرنل صاحب نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ انھیں رخصت کرکے کرنل صاحب پھر کمرے میں آئے اور دیر تک جیمس کا چہرہ تکتے رہے۔ اس پر بدستور غفلت چھائی ہوئی تھی۔ نرسنگ اردلی کو اس کے پاس رہنے کی تاکید کرکے وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

دالان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کمرے سونے تھے۔ ایک

دہشت بھری ویرانی کا ہر طرف راج تھا۔ کرنل صاحب دیر تک زینے
کے سرے پر کھڑے سوچتے رہے۔ کس طرح خود کو بے فکر ظاہر کر کے وہ
سب کے سامنے جا سکتے ہیں، کس طرح وہ جھوٹ بول سکتے ہیں، کس طرح
وہ سب کو باز رکھ سکتے ہیں کہ وہ شبیر کو دیکھنے نہ جائیں۔ [illegible]
انھوں نے کھمبے کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں — پھر الطاف، [illegible]
شباہت، سریر اور توقیر آ گئے۔ انھیں دیکھ کر کرنل صاحب نے خود کو
سنبھال لیا۔ ان پر پریشان کن سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

"یقین کرو کہ وہ اچھے ہیں" انھوں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ "ہم
نے نیند کا انجکشن دیا تھا۔ لہٰذا ان پر بے ہوشی کی طرح نیند طاری ہو
گئی ہے۔ شام تک ہوش آ جائے گا۔ فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بھائی امی کو ذرا کمرے کھلوا دیجئے" سریر روہانسی ہو کر بولی۔ "مجھے
ہماری بات کا یقین نہیں آتا۔"

"ہم جا کے شبیر بھائی کو دیکھ آئیں چچا جان!" توقیر نے [illegible] سے
پوچھا۔

"کیا فائدہ؟" کرنل صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "کچھ انتظار
کرو۔ جب ہوش آ جائے میں کھلوا دوں گا — اچھا بیٹی، غسل خانے میں
گرم پانی رکھوا دو۔ میں نہاؤں گا۔ بہت تھک گیا ہوں" یہ کہہ کر
وہ اندرونی کمروں کی طرف بڑھ گئے۔

نگینہ بیگم کے پاس ان کی ملازمہ بیٹھی تھی۔ وہ گھبرائی آواز میں چپکے
چپکے اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ کرنل صاحب کو دیکھ کر ملازمہ اٹھی اور
سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ کرنل صاحب بیوی کے پاس آ بیٹھے۔

"اسے ہوش آیا؟" ثمینہ بیگم نے پوچھا "کیوں نہیں دکھا دیتے مجھے ایک نظر؟ ارے بڑی سخت جان ہوں۔ مروں گی نہیں... میں اپنے بچے کو تو دیکھ لوں۔"

"بیگم! مجھے بتاؤ کہ اس قسم کی باتوں سے فائدہ کیا ہے؟" کرنل صاحب نے کہا "تم خدا پر ایمان رکھتی ہو اور جانتی ہو کہ ہر قسم کے حالات منجانب اللہ ہیں۔ ہماری گریہ وزاری، فریاد و نالے ہماری تقدیر کو نہیں پلٹ سکتے۔"

"یہ کیسی باتیں آپ کر رہے ہیں" انھوں نے دل تھام لیا۔ "میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائیے کہ وہ اچھا ہے۔ ورنہ میں جاتی ہوں اسے دیکھنے۔ خدا کی قسم کسی کے روکے نہ رکوں گی اب۔"

"قسم کھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے بیگم! تم یقین کرو کہ وہ ہر طرح ٹھیک ہے۔ وہ تو مجھے بھیم درجاکے ایک عجیب دور سے گزار رہا ہے۔ بے حس ہو کر رہ گیا ہوں۔"

ملازم نے خبر سنائی "بیرسٹر صاحب آئے ہیں۔"

دوسرے لمحے رخسانہ اور مدحت دالان میں دکھائی دیں۔ ان کے سلام کا جواب دے کر کرنل صاحب باہر چلے گئے۔ رخسانہ ثمینہ بیگم کی طرف گئیں اور مدحت لڑکیوں میں جا بیٹھی۔

شاہدحت تو نہ جانے کب اٹھا سیدھا ناشتہ کر کے عنبر کے پاس چلا گیا تھا۔

"ہمیں تو تھوڑی دیر پہلے ان کے دوست سے اطلاع ملی۔ خالہ جان" رخسانہ نے کہا "یہ اچانک آخر ہوا کیا؟"

ثمینہ بیگم آنسو پونچھتی گئیں اور سارا قصہ کہتی گئیں۔
"اچھا میں دیکھ آؤں عنبر بھیا کو؟" رخسانہ اٹھنے لگیں۔
"ابھی کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملی بیٹی!" وہ آہ بھر کر بولیں "بس دعا کرو کہ جو کچھ دیکھو اچھا دیکھو۔"

راحت نے سر پر وتوقیر کو دیکھا اور دونوں نے اسے۔ پھر ساتھ ساتھ سب کی نظریں جھک گئیں۔ کسی کے ہونٹوں سے کچھ نہ نکلا۔ وہ تو عجیب ٹوٹی ٹوٹی سی لگ رہی تھی۔ سادے سیدھے کاسنی رنگ کے لباس میں بیٹھی جیسے مونگیے کے پھولوں کا مرجھایا ہوا ہار ہو۔ نگاہیں فرش پر تھیں، اور سوچ رہی تھی یہ اضطرار کی کیفیت جس پر خود اس کا بس نہیں دوسروں سے کب پوشیدہ رہ سکے گی۔ اب تو جھوٹے تبسم کی نقاب میں اپنی قلبی اذیتوں کا چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ بڑے جاں گسل جادۂ حیات سے گزر رہی تھی۔ قدم قدم پر جہاں کھائیاں تھیں۔ غار تھے اور تاریکیاں تھیں۔
کوئی کیا کہے گا۔
عنبر اس کا کون تھا؟
اس کے اپنے لوگ اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔
اگر کسی نے اس کے دل کا حال جان لیا تو کیا کہے گا۔
توقیر نے اس کی ساری حالت بھانپ لی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں جھانک لیا تھا۔ جیسے گہری ندی کی تہ میں جھل مل کرتا پانی۔ بے برگ و گیاہ صحرا میں سراب کا سا خیال۔

"وحشت کیا سوچ رہی ہو؟" سریر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس نے سر کو منفی جنبش دے کر ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا... کیا جواب دے وہ۔ اس نے بھی خواب دیکھے تھے حسین و معصوم... پھولوں بھرے راستے پر چل کر ایک محبوب ہستی تک جا پہنچی تھی۔ وہ راستہ یک بیک خارزار میں بدل گیا۔ اب اس کے سامنے اپنا چٹیل میدان تھا جس میں حد نظر تک، چھائیں چھائیں کرتی ہوئی دھوپ پھیلی تھی۔

بلا ارادہ وہ خلا میں تکتی رہی۔ اس کے دل میں وہ بھاری اور پرکشش آواز گونجتی رہی جو اس چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی دل میں اُمڈ آئی تھی.... جس نے اس کا صبر و قرار چھین لیا تھا۔

وہ ساز دلنشیں جن میں ربط نہیں تھا مگر وہ بھولے ہوئے ماضی کے کسی دور کی کہانی ضرور سناتے تھے۔ اس کی مخصوص ہنسی کا انداز، وہ خوبصورت چمکیلے خیال، اس کا پرکشش پیکر، وہ دیوانگی۔ کاش! وہ لمحے واپس لوٹ سکیں۔

کاش ماضی کو دہرایا جا سکتا۔

ایک ایک بات، ایک ایک یاد جیسے وہ ذہن میں بیٹھا سرگوشیاں کررہا ہو۔

"میں تو جانتا تھا۔ جہاں اور دوسرے لوگ، اپنے پرائے، دنیا، سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ ایک دن تم بھی اسی طرح ساتھ چھوڑ جاؤ گی۔"
خبردار پھر کبھی نہ دیکھنا میری طرف ان آنکھوں سے جن کے پیغام کو میں جھٹلا نہ سکوں۔ خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔

منو! تم اتنی پیاری کیوں ہو گئی ہو؟

منو! اگر تمھارا ملنا میری زندگی ہے تو تمھاری جدائی میری موت ـ

اللہ اللہ... آنسو اس کے رخساروں سے ڈھلک کر فرش پر گرنے لگے

اب کیا رہ گیا ہے اس زندگی میں؟

دل ٹوٹا کوئی صدا نہ دی۔ کم از کم کسی بے درد کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی۔

"بس کرو نزہت... یہ تو بدشگونی ہے" سرور نے کہا اور اس کے آنسو پونچھ دیے۔

"کسی نے انھیں نہیں دیکھا؟" نزہت نے پوچھا "اشتیاق بھیا تو کچھ بھی نہیں بتاتے۔"

"سب یہی کہتے ہیں کہ بس خدا سے دعا مانگو۔" توقیر نے کہا۔

"دعا؟" ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی... "یہ تو دل کا بہلاوا ہے توقیر! میری دعا اگر قبول ہو جاتی تو میں آج بدنصیب کیوں کہلاتا۔ جان بوجھ کر اپنے ہاتھ سے کون برباد ہوتا ہے؟"

باہر صحن میں دھوپ تیز ہونے لگی۔ لڑکیاں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

کرنل صاحب کو دیکھ کر دانش نے کھڑے ہو کر جھک کر ادب سے سلام کیا... اور کرنل صاحب کے بیٹھنے کے بعد خود بھی کرسی سنبھالی۔

"جناب یقین نہیں آتا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر نوازش سے یہ سنا کہ شبیر صاحب نے خودکشی کی کوشش کی" دانش صاحب نے کہا۔

"ہاں بیٹے!" کرنل صاحب نے کہا اور انھیں بھی سارے واقعات

سے آگاہ کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں متحیر تھے۔ کیوں بیرسٹر صاحب
کی قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ یا تو وہ جلال تھا کہ ضمیر کا تذکرہ سننا
پسند نہیں کرتے تھے۔ اور یہ انداز جمال ہے کہ پریشان پھر رہے
ہیں۔ ڈاکٹروں کو تلاش کر کر کے لا رہے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ
ضمیر کو جلد تر صحت حاصل ہو جائے...

کرنل صاحب نے اندازہ نہیں لگایا۔ دانش صاحب کا حساس
دل تھا اور ان کا ضمیر زندہ تھا۔ انھیں اس تبدیلی کا شدت سے
احساس تھا کہ ان کے خط ہی نے یہ سارا جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ بلا سے
وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے۔ پاگل کی بکواس کا جواب صرف
خاموشی تھا۔ انھوں نے جواب الجواب سے اسے مزید پاگل کر کے اس
درجے تک پہنچا دیا۔ اب وہ ضمیر کو بہت پسند کرنے لگے تھے جب سے
اسے قریب سے دیکھا تھا۔

"میاں! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں" کرنل صاحب نے
کہا "آپ کا سلوک مجھ بدنصیب بوڑھے کے حال پر مجھے کسی اچھی بات
کی خبر دیتا ہے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کے اصرار نے
بڑی تقویت اور مضبوطی عطا کی۔ میاں! اب میں بہت بوڑھا اور
بیکار ہوں۔ پے بہ پے صدموں نے مجھے زیادہ شکستہ کر کے رکھ دیا ہے۔
ماشاء اللہ آپ کے سے جوان اور طاقت ور انسان کے ساتھ کے خیال
نے مجھے از سر نو ہمت بندھا دی ہے۔ ابھی میں اپنے ہمدرد رکھتا ہوں"

ان کا لہجہ ایسا کمزور بے بس اور متاثر کن تھا کہ دانش کے دل پر بہت
اثر ہوا۔ انھوں نے بڑے خلوص سے اور سچے دل سے کہا "کرنل صاحب!

یہ خدا کا شکر اور احسان ہے کہ آپ کے دل میں میری اتنی محبت موجود ہے۔ مجھے خوشی ہے جناب کہ میری گستاخیوں اور بدتمیزیوں کا جواب آپ نے صبر و بردباری اور خیریت سے نہیں دیا۔ یقین کیجیے محترم! کہ میں آپ کو واقعی اپنا بزرگ سمجھتا ہوں اور مجھے [illegible] ہوں ... کرنل صاحب ... میں آپ سے التجا کرتا ہوں [illegible] میری پچھلی تمام گستاخیاں معاف کر دیجئے"

کرنل صاحب کے ہونٹوں پر شفیق سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "بیٹے! یقین کرو کہ مجھے ان کا خیال ہی کب تھا۔ جو کچھ زیادتی تم نے [illegible] کی تھی اس کا اصل محرک تو میں تھا۔ پہلی زیادتی میں نے [illegible] کی تھی"

"نہیں جناب ... وہ زیادتی نہیں تھی" دانش نے [illegible] سر جھکا لیا۔ اور ندامت انگیز لہجے میں کہا "بے قراری میں [illegible] نیک بد کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی حالت اس آدمی [illegible] جیسی ہے جو طوفانی موجوں میں ہاتھ پیر مارے اور کسی طرح [illegible] کی جدوجہد کرے۔ میں پہلے آپ کی مجبوریوں کو سمجھ [illegible] وجہ سے میں نے ایک فضول خط لکھ دیا تھا جو موجودہ [illegible] بربادی کا باعث بنا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ——"

"نہیں بیٹا! وہ کچھ نہیں" کرنل صاحب نے ان ہی [illegible] "دیکھیں تم سے کہہ چکا ہوں کہ پچھلی باتیں میں سب بھول گیا اور تم بھی بھول جاؤ۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ فی الحال کیا کرنا چاہیئے"

"موجودہ صورت حال پر آپ ہی بہتر طریقے سے قابو پا سکتے ہیں۔ جناب والا! آپ کو بھلا سبق پڑھانے کی جسارت کون کر سکتا ہے؟"

دانش نے کہا۔ پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر بولے "میں آپ سے کچھ اور عرض کرنا چاہتا تھا... مجھے اجازت دیجئے"

"شوق سے کہو میاں! تکلف کس بات کا؟"

"کرنل صاحب! پچھلی تمام باتوں پر اور ہر قسم کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں نے پختہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کی مرضی مجھے بہر حال پوری کرنی چاہیئے۔ آپ جس طرح عبیر کے بزرگ و بہی خواہ ہیں اسی طرح میری بہن کے بھی بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یقیناً اگر آپ عبیر کا برا نہیں چاہتے تو مدحت کی بربادی کے خواہاں کبھی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میری طرف سے عبیر و مدحت کا رشتہ پختہ سمجھئے"

"ان حالات میں ــــــ؟؟" کرنل صاحب بے حد تعجب سے دانش کو تکنے لگے۔

"حالات بہتر ہو جائیں گے" دانش نے کہا۔ "میں مدحت کو آپ کو دے چکا۔ جو بہتری اس کے حق میں آپ مناسب سمجھیں وہ کیجئے۔ اچھا میں شام کو عدالت سے پھر حاضرِ خدمت ہوں گا... اب اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض ہے"

انہیں اب اتنی اجازت ملی تھی کہ وہ خاموش آئیں اور اسے دیکھ جائیں۔ انسانی فطرت بھی عجیب چیز ہے۔ جب کوئی افتاد نئی نئی پڑتی ہے تو اس کی شدت سے آدمی بوکھلا جاتا ہے۔ موت کی دعائیں مانگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مصیبت کا کوئی مداوا اب نہیں رہ گیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے احساس کی تندی اور شدت میں بتدریج کمی ہونے

لگتی ہے اور وہ مصیبت جو پہاڑ معلوم ہوتی ہے معمولی بن کر رہ جاتی ہے۔
یا کم از کم اتنی زبردست نہیں رہتی۔

یہی حال عنبر کی بیماری کا بھی تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش تھا۔ روز روز اس کے زخموں کی ڈریسنگ کی جاتی۔ روز نئی تدبیریں کی جاتیں۔ مگر اسے ہنوز ہوش نہیں آیا تھا۔

اسے ہسپتال سے کوٹھی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب وہ دالان میں رکھا گیا تھا۔ یہاں صبح و شام اس کے ارد گرد ایک ہجوم رہتا۔ شباہت کی والدہ بھی لاہور سے آ چکی تھیں۔ وہ بھی یہیں مقیم تھیں۔ ڈاکٹر زیدی کا ایک بچہ ڈاکٹر دیپ اس کا علاج کر رہا تھا۔ ڈاکٹر فرانسس بھی اس کے ہوش میں آنے کے منتظر تھے تاکہ اپنا ٹریٹمنٹ بروئے کار لائیں۔ انہوں نے عنبر کے تمام دوستوں کے پتے اور حلیے حاصل کر لیے تھے۔ اور وہ سارا واقعہ سیٹ اپ کر لیا تھا۔ جس نے عنبر کو ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا... وہ تمام گیت اکٹھا کر لیے تھے جو کبھی عنبر نے تیار کر لیے تھے۔ بہرحال ان کے علاج کی باری ابھی نہیں آئی تھی۔
ویسے وہ روز آتے تھے۔ اور ہدایات بھی دیتے تھے۔

شباہت نے اپنے دوست کی خدمت کا حق ادا کر دیا تھا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ برائے نام ہی دن کو ایک جھپکی لیتا تھا اور ساری رات عنبر کے پاس جاگتا اور منتظر رہتا کہ کب وہ آنکھیں کھولتا اور اسے آواز دیتا ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ ناشتے کے بعد وہ سب عنبر کے پاس اکٹھا ہوئے تھے کہ انھیں ڈاکٹر زیدی کے آنے کی اطلاع ملی۔ عورتیں دوسرے کمرے

میں ہو رہیں۔ لیکن سریر وہیں کھڑی رہی۔

"اندر نہیں جاؤ گی سریر؟" شباہت نے پوچھا۔

"زخم دیکھوں گی شباہت بھائی" سریر نے عبیر کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کی مسہری کی پٹی پکڑ لی اور عبیر پر نظریں گاڑ دیں۔

ڈاکٹر اندر آئے اور روز کی طرح ڈریسنگ کا سامان کرنے لگے۔

"بے بی۔ آپ یہاں سے ہٹ جائیے" ڈاکٹر شوکت نے عبیر کی پٹی کھولتے کھولتے دفعتہً رک کر کہا۔ وہ بے لبسی سے شباہت کو دیکھنے لگی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر نے پٹی کھولنا شروع کی۔

ایک کے بعد ایک ــ پھر کنپٹی سے لے کر پیشانی تک اور بائیں طرف مانگ کے پاس تک ایک لمبا اور گہرا زخم دیکھ کر سریر کی آنکھوں میں یک بیک تاریکی چھانے لگی ... سر چکرانے لگا۔

کرنل صاحب عبیر پر جھکے ہوئے آہستہ روئی کے نرم پھاہے سے اس کا زخم صاف کر رہے تھے۔ جیسے ان کے ہاتھ سریر کے دل پر چلنے لگے۔ اس کا دل کھنچتا گیا ... تاریکی میں رنگ برنگی لہریں تلملانے لگے۔ سارا ہال اوپر نیچے ڈولنے لگا۔ ڈاکٹر اس کی آنکھوں کے سامنے سے مٹنے لگے۔ چیزیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ عبیر کا بستر کبھی چھت پر پہنچ جاتا کبھی فرش پر آ رہتا۔ سریر کے ہاتھ سے پٹی چھوٹنے لگی۔ پھر زخم کا سارا خون صاف ہو گیا۔ ایک سرخ سرخ گہرا زخم سریر کی آنکھوں کے سامنے تھا

"عبیر" ایک جگر خراش چیخ سریر کے لبوں سے نکلی۔ اور وہ دھڑام سے عبیر کے پلنگ پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ دھچکا اتنا زبردست تھا کہ عبیر کا سارا جسم ہل کر رہ گیا۔

کے آگے نامانوس رنگ کی دبیز چادر سی تان دی تھی ۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا اور پھر کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ اس کے پپوٹے بند کر دیتا۔

اس کے اطراف سب دم بخود کھڑے تھے ۔ اس کے ہوش میں آنے کے بےچینی سے منتظر ___ امید و بیم کے جانگسل لمحات ۔ آس و نراس کی روح فرسا کشمکش جیسے کوئی کسی کو کچھ دینے کے لیے بار بار ہاتھ بڑھائے اور بار بار کھینچ لے ۔

کرنل صاحب نے اسے کوئی انجکشن دیا ۔ اور سریہ جو ضبط نہ کر سکی ۔ اس نے اسے آواز دے لی :

"میرے نجیب! اب کھول دو آنکھیں ۔" وہ خوش بھی تھی اور خائف بھی۔ بے ارادہ بے ضبط ہو کر اسے آواز دی تھی ۔ لیکن اس کی آواز میں نہ جانے کون سا سحر پوشیدہ تھا کہ نجیب نے آنکھیں کھول دیں ۔ مگر سریہ کو کوئی جواب نہیں دیا ۔ تھکن، غفلت، کمزوری اور نہ جانے کون کون سی تکلیفیں اس پر طاری تھیں کہ بے اختیار اس کے ہونٹوں سے کراہیں پھوٹنے لگیں ۔

"بہت غنیمت ہے" کرنل صاحب نے کہا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ ___ " شجاعت وہیں فرش پر سجدہ ریز ہو گیا ۔ سریہ کبھی ہنستی، کبھی احمقوں کی طرح ایک کو تکتی ۔ اتنے میں اندر بھی اطلاع کی گئی کہ نجیب کو ہوش آ گیا ۔ مگر وہ کسی کی پکار کا جواب نہیں دے رہا ہے ۔ تہمینہ بیگم کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ۔ وہ کانپتی لرزتی اٹھ کھڑی ہوئیں اور گرتی پڑتی ادھر چلیں جہاں نجیب تھا ۔ مرتعش دلدوز آواز میں کہتی جاتی تھیں :

"مجھے لے چلو اس کے پاس ۔ میری پکار کا وہ ضرور جواب دے گا ۔" اور پھر الجھ کر فرش پر گر پڑیں ۔

"خالہ جان! ذرا صبر کیجیے" رخسانہ نے جھپٹ کر انھیں سنبھالا اور

لڑکیوں نے مل کر انھیں اٹھایا اور کرسی پر بٹھال دیا۔ سطوت جہاں نے فوراً باہر سے خبر منگوائی۔ ملازم نے واپس آکر جواب دیا:

"ابھی وہی حالت ہے۔ آنکھیں کھولتے ہیں اور پھر بند کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر جیول یگیٹ کو فون کیا گیا ہے۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔"

"ارے خدا کے واسطے مجھے لے چلو باہر..." تمیزہ بیگم ہاتھ پھیلا کر گڑگڑائیں۔ "ایک نظر دکھا دو۔ پھر میں اس پر سے قربان ہو جاؤں... ہائے ظالمو! کچھ تو رحم کرو میرے حال پر۔"

"بھابھی جان! ادھر تو سارے مرد بھرے ہوئے ہیں۔ آپ ان میں کیسے جائیں گی؟" سطوت جہاں نے کہا "بہت سے ڈاکٹر ہیں اٹھنے چلنے والے ہیں۔ بڑی گڑبڑ ہے ادھر۔"

"ارے مجھ بڑھی آدمی کا کس سے پردہ ورده۔" وہ خوشامد سے گھگھیائیں۔ پھر خادم لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئیں "چل بیٹی! مجھے پہنچا دے۔ اب صبر نہیں ہوتا مجھ سے۔"

اتنے میں شباہت سر پر کولا کر اندر چھوڑ گیا۔ اور کہہ گیا کہ خبردار کوئی باہر مردانے میں نہ آئے۔

"اس کا جی کیسا ہے؟ کوئی تو بتائے۔ یہ سب کیسے اتنے جلاد ہو گئے مجھ پر ترس نہیں کھاتے۔ کیوں مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ شباہت! شباہت! تجھے اپنی دوستی کا واسطہ۔ میرے بیٹے!! لے چل مجھے باہر۔ میرے بچے!!!" شباہت گوگو میں پڑ گیا۔ دوستی کا واسطہ اس کے لیے بڑی قسم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور سنجیدگی سے بولا "بہت اچھا۔ چلیے میرے ساتھ۔"

کرنل صاحب نے بڑی حیرت سے اپنی بیوی کو دیکھا، سب نے دیکھا۔ کچھ

احتراماً وہ ہٹ کر کھڑے ہو گئے، کسی نے تنقیداً راستہ دیا۔ وہ سب خاموش تھے۔ نجمہ بیگم کی نظریں جیسے ہی عبیر پر پڑیں۔ وہ شباہت کا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھیں اور اس کے پہلو میں فرش پر گر پڑیں۔ سسک کر ایک ہاتھ عبیر کے سینے پر رکھ دیا۔ مگر شدتِ گریہ نے ان کی زبان بند کر دی تھی۔ پھر جب دل کی لہروں کی حالت سنبھلی تو انھوں نے عبیر کو دیکھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں ان کے لبوں سے نکلنے لگیں۔

اچانک کرنل صاحب ان کے پاس آ کھڑے ہوئے اور ان کا کندھا چھو کر بولے "بیگم! کیا سوچ رہی ہو۔۔۔؟ ادھر دیکھو! تمھارے بچے نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ شکر ہے خدا کا! شاید وہ تمھاری پکار کا جواب دے رہا ہے۔۔۔"

نجمہ بیگم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر لرزتی آواز میں پکارا "عبیر! میرے بچے!!! آنکھیں کھولو! دیکھو میں۔۔۔ پکار رہی ہوں۔۔۔ میرے لعل!!۔۔۔ اب کیسا جی ہے تمھارا؟ کہاں درد ہے؟ میرے لال۔۔۔ کچھ تو بولو۔ میرے بچے! کچھ تو کہو۔۔۔"

جھرجھری ہوئی آواز اس کے شعور سے ٹکرائی۔ جیسے کسی لق و دق صحرا میں کوئی دور سے کسی کو پکارے اور پتہ نہ چلے کہ کس نے کس کو پکارا؟

شباہت بھی پاس ہی کھڑا ہوا اور بڑی شدید اثر نظروں سے نجمہ بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ان دردوں کا مسیحا انھیں کو سمجھتا ہو۔۔۔؟

نجمہ بیگم اٹھ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ ان کی حالت دیوانوں سے بدتر تھی۔ اتنی بے تاب اور مضطرب تھیں کہ ان کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچنا کسی سے ممکن نہیں۔ بے انتہا بے قرار ہو کر انھوں نے عبیر کے لبوں پر اپنے لب

"ابھی تک ڈاکٹر فرانسس کا پتہ نہیں" انھوں نے کہا "حالانکہ ان کا پروگرام تھا کہ جیسے ہی عنبر کو ہوش آئے گا کوئی خاص نغمہ اسے سنوایا جائے گا مگر نہ ان کا پتہ ہے نہ نغمے کا۔ بڑی دیر کر دی —"

شباہت آکر بڑے پیار سے عنبر پر جھکا اور اس کے رخسار تھام کر کہا:
"عنبر! مجھے پہچانا؟ میرے پیارے بھائی!"

اس کی تھکی تھکی سی نگاہیں اٹھیں، بھٹکیں، مانوس و نامانوس چہروں سے پھسلتی شباہت کے چہرے پر جم گئیں۔ ایک مضمحل مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھری۔
"شباہت ... ؟" اس کے لب کانپے ..." کیا میں تمھیں۔ نہیں پہچانتا؟"

شباہت نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ روتا ہوا اچھلا تھا، ہنستا ہوا سیدھا ہوا —

"ممی! کیا بات ہے ..." عنبر نے تھم تھم کر کہا "آپ ... شباہت ... کیوں رو رہے ہیں؟"

"تم کو [illegible] نے مجھے بخش دیا۔ میری اندھی آنکھوں کی روشنی! یہ خوشی کے آنسو [illegible] بیگم نے کہا۔

[illegible] نے ڈاکٹر فرانسس کی آمد کی خبر سنائی۔ کرنل صاحب نے فوراً اٹھ [illegible]۔ شباہت عنبر بیگم کو اندر چھوڑ کر واپس آگیا۔ عنبر پر غنودگی سی طاری تھی۔ سب اکھاڑ پچھاڑ سے بے خبر وہ کسی اور ہی جہان کی سیر کر رہا تھا۔ ماحول سے بے خبر و بیگانہ — ڈاکٹر فرانسس کی آمد آمد نے ایک سنسنی پھیلا دی۔ وہ عنبر کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر بہت مسرور ہوئے اور جھپٹ کر اس کے قریب آئے، نام لے کر مخاطب کیا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ہیلو۔ مسٹر جبیر! انھوں نے بہت پرانے دوست کی طرح چہک کر کہا اور اسے جواب کا موقع دیے بغیر بولے " غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا...." وہ ہنسنے لگے۔

جبیر نے ان کے سوال کا جواب دیے بغیر کمرے میں موجود حاضرین پر نظر ڈالی۔ انہوں کو فوراً پہچان لیا۔ مگر ڈاکٹروں کے چہروں سے اس کی نظر واپس پھر کر فرانسس کے چہرے پر رُک گئی۔

"کہو جبیر کہو!!" شباہت بے تاب تھا " تم سب کو پہچانتے ہو نا؟"
وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ جبیر پھر کوئی الٹا سیدھا جواب دے گا۔ مگر اس نے بڑی نرمی اور شائستگی سے کہا۔ " شباہت... اب کون سی نئی بات ہو گئی ہے؟"

" خدا کا شکر ہے" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

" اور یہ... یہ صاحب کون ہیں؟... اس نے ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

" ڈیڈی کے ساتھی۔ شاید کوئی۔ سول سرجن" اس نے جواب دیا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے" ڈاکٹر فرانسس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر کرنل صاحب کو الگ لے گئے۔

" مجھے سو فی صدی یقین ہے کرنل!" انھوں نے پر جوش لہجے میں کہا " وہ اپنی پچھلی حالت پر لوٹ گئے۔ فکر و تشویش کی اب کوئی بات نہیں"
"پچھلی حالت۔ یعنی دیسی دیوانگی... جو اس حادثے سے پہلے تھی۔ کرنل صاحب نے پوچھا۔

" بالکل نہیں" ڈاکٹر فرانسس نے جلدی سے کہا " بلکہ دیوانگی سے پہلے

والی حالت جب وہ ہر طرح صحت مند تھے دماغی طور پر... ۔"

"آپ نے کس طرح اندازہ لگایا؟ — خدا کرے کہ آپ کا خیال ٹھیک ہو۔"

"ٹھہریئے! ابھی کا امتحان بھی ہوا جاتا ہے۔" ڈاکٹر فرانسس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مگر فی الحال ان کے ذہن اور اعصاب پر اس طرح کے مشکوک سوالات کا بار نہیں ڈالنا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"انشاء اللہ... جو خدا کو منظور ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب! اگر انھوں نے اپنے سر کے زخم کے متعلق استفسار کیا؟" شبانہ نے پوچھا۔

"پہلا ثبوت بہت واضح ملے گا..." وہ ہنس کر بولے "اگر انھوں نے زخم کے بارے میں پوچھا تو ہم... دیوانگی کا وقفہ اپنی مدت پوری کر کے ختم ہوا... یا پھر کہہ دیں گے کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا... وہ خود بھی تو یہی چاہتے تھے نا؟"

"جی بہت بہتر!" شبانہ نے سر ہلا کر جھک کر کہا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔

"آپ یقین جانیئے مسز اختر!" ڈاکٹر فرانسس نے کہا "اگر وہ اپنی گزشتہ حالت پر لوٹ آئے ہیں۔ تو پھر یہ پانچ سالہ خود فراموش زندگی انھیں ہرگز ہرگز یاد نہ آ سکے گی۔ جس طرح کیفیت جنون میں وہ صحت مند زندگی بھول گئے تھے۔ یقیناً اسی طرح وہ اپنی دیوانگی بدحواسی اور خود فراموشی کو بھول جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ آرام سے سونے کی کوشش کیجئے۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر۔۔! میرا آپریشن کیوں کیا گیا؟" اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا مجھے؟"

"ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا بیٹا!" کرنل صاحب نے دست چمکار کر کہا "تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ چونکہ ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا۔ آپریشن کرنا پڑا۔"

"اچھا ڈیڈی!" اس نے ایک بڑی طویل سانس لے کر کہا اور پھر نہ بولا جب ڈاکٹر کو یقین ہو گیا کہ وہ بے خبر سو چکا ہے تو وہ واپس صوفے پر جا بیٹھے اور دیر تک کرنل صاحب سے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔

اصلی معنوں میں اگر کوئی خوش تھا تو مسٹر دانش۔ وہ اپنی مسیحائی پر نازاں تھے۔ کرنل صاحب بھی ان کے بے انتہا شکر گزار تھے۔ دونوں گھرانوں میں اتنا میل جول ہو گیا تھا کہ انہوں نے نہ ہوتا۔ رخسانہ نے تھیمز بیگم کی خدمت اور تیمارداری حقیقی بیٹی کی طرح کی تھی۔ دانش نے چھوٹے بھائی کی طرح کرنل صاحب کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے آپس کے میل جول نے جہاں ادروں کو تقویت دی تھی وہاں مرحت کی تاریک زندگی میں امید کی ایک شعاع چمکا دی تھی۔ اس نے پرخلوص اپنے لیے فال نیک جانا۔۔۔

تھیمز کی موہوم سی صحت نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ویسے

ابھی وہ بیمار بھی تھا اور زخم بھی مندمل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرانسس کے ہاتھ میں آخری نفسیاتی علاج رہ گیا تھا۔ بالآخر وہ آہی پہنچا...

مسٹر فرانسس بڑی دیر سے سنگیت کی اس فہرست کا معائنہ کر رہے تھے جو اُن کے ہاتھ میں تھی۔ کم و بیش ڈھائی تین ہزار گیتوں کی مکمل لسٹ تھی جس میں فارسی غزلیں، اردو نظمیں ہندی کے دوہے اور انگریزی کے سونیٹس تھے۔

ڈاکٹر فرانسس کا چہرہ مرجھ ہو رہا تھا۔

"کاش! وہ مخصوص گیت مل جائے" وہ بڑبڑائے "یہی تو ثبوت ہے"

انھوں نے بڑی عرق ریزی اور مکمل چھان بین سے پتہ لگا لیا تھا کہ وہ آخری شادی جس میں وہ دوست کی بہن سجاتا کی تھی، جس کی شرکت کے بعد خاندان کے افراد کو اس کے حواسوں پر شبہ ہوا تھا، جس کی تصدیق شمیمہ بیگم نے بھی کی تھی۔ جب ڈاکٹر فرانسس نے ان سے دریافت کیا تو وہ پردے کی آڑ سے بولی تھیں۔

"ہاں وہی نگوڑی تھی۔ ایک مرتبہ کسی بچے کی سالگرہ میں ہم لوگ گئے تھے تبھی اس لڑکی کو میں نے دیکھا تھا۔ اتنی خوبصورت تھی کہ میں تو اسے انسان سمجھنے پر تیار نہ ہوئی۔ میں نے تبھی آپ کے کرنل صاحب سے کہا تھا کہ ہو نہ ہو کسی جن نے یا شہید مرد نے اس پری پیکر لڑکی کا بھیس بدلا ہے۔ عورتیں اسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتی تھیں، مرد تو درکنار۔ میں نے ہمیشہ ان کو منع کیا کہ بیٹا اس کے قرب سے باز آؤ۔ مگر...

ایک نہ سنی۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے خطرہ تھا۔ اس کی شادی میں بن ٹھن کر پہنچا تھا۔ اور وہ بھی ایک شہزادے سے کیا کم لگ رہا تھا۔ میں اس پر سے نظر اُتارنا بھول گئی تھی۔ پھر جب ایک بجے رات کو وہ واپس ہوا تو بھی اس کی گفتگو اور انداز سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ خدا نہ کرے اپنے آپے میں نہیں رہ گیا ہے۔ پھر میرا اندیشہ سامنے آیا۔ پانچ سال گزر گئے "

اس کے بعد وہ اس گیت کی کھوج میں لگ گئے۔ انھوں نے لڑکیوں سے پوچھا۔

"سیلابی سرپر!... کیا تم اس شادی میں شریک تھیں؟"

"جی نہیں" اس نے مایوس اور خوفزدہ ہو کر سر ہلا دیا۔

پھر انھوں نے توقیر سے سحابی اور شگفتہ کے متعلق استفسار کیا۔

"جی نہیں... میں نے یہ نام ابھی آج تک نہیں سنے" توقیر بولی۔

"آپ مسٹر اختر؟" وہ کرنل صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"میں نے آپ سے اس سے پہلے بھی کہا تھا جناب والا کہ میں ان کے دوستوں کو بالکل نہیں جانتا"

"شباہت.... ! تم بتاؤ"

"بہت عرصہ پہلے میں نے یہ نام ضمیر کی زبانی سنے تھے۔ جناب! مگر ان کے متعلق اور کچھ بھی میں نہیں جانتا" شباہت بولا۔

"پھر سرپر کو کیسے معلوم ہوگئے یہ نام؟" انھوں نے کہا۔

"اس نے ضمیر سے سنے تھے۔ انھوں نے جب سحابی کی مجھ سے تعریف کی تھی تو مجھے بے حد غصہ آ گیا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ تم ایسے

"گیت کس کا لکھا ہوا ہے؟"

"جہاں تک میں جانتا ہوں جناب! ہر ریکارڈ پر تاریخ مع سن کے درج ہے اور منظمی صاحب کی شادی کے بعد سے چونکہ جبیر کا ذہن متاثر ہو گیا تھا۔ اس لیے اس تاریخ سے انھوں نے نہ تو کوئی دھن بنائی نہ کسی کو دی۔ وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ یوں وہ اپنے طور پر ساز بجاتے تھے، گاتے بھی تھے۔ مگر باقاعدہ ریکارڈ کرنے کی نیت سے نہیں .... اگر ریکارڈ روم میں دیکھا جائے تو وہ ریکارڈ مل جائے گا" شباہت نے کہا۔

سب کے سب اس مہم میں جٹ گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے جب وہ آخری ریکارڈ شباہت کو مل گیا جس پر متعلق سب درج تھا۔ سارے کمرے میں ریکارڈ بکھرے ہوئے تھے۔

"بس یہ آخری موقع ہے" ڈاکٹر فرانسس نے کہا "اس کے بعد یا تو میں خود کو تجربہ کار مان لوں گا یا پھر بالکل اناڑی سے" وہ ریکارڈ اپنے کمرے میں لے گئے۔

تاریک رات کا پر فسوں سناٹا سارے گھر پر چھایا ہوا تھا۔ کم از کم جبیر تو اپنی جگہ یہی سمجھا۔ اسے شباہت کھلا پلا کر جلدی چلا گیا . . . . نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ سر کا درد کنپٹیوں میں ٹیسیں بن کر اتر آیا تھا۔ عجیب سی جانگسل تکلیف تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہنی آنکھوں پر ڈھک لی۔ کمرے میں خواب گوں سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے خنک و معطر ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ پھر کسی نے چپکے سے اندر جھانکا اور اسے نیم خوابیدہ دیکھ کر تیزی سے واپس پلٹ گیا۔

"ابھی وہ سوئے نہیں ....." شباہت نے پھولی پھولی سانسوں پر قابو حاصل کر کے ڈاکٹر فرانسس سے کہا۔ انھوں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

بہت مدھم، پُر سوز اور بے انتہا درد انگیز دھن میں اس کی اپنی آواز سناٹے میں ابھری جیسے خواب میں ابھری ہو۔

دفعتہً ظہیر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور سوچنے لگا، وہ خواب دیکھ رہا تھا یا یہ حقیقت تھی ... وہ اپنے وہم یا یقین کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ اس کی سانسیں رک گئیں اور گم صم سا سنگیت کے سیلاب میں بہہ گیا ؎

آغاز کے گاتے لمحوں کی اب ذہن میں گونج نہیں باقی
بے کیف سا ہے انجام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

گیت کی لے آہستہ آہستہ اونچی ہونے لگی۔ گہرے سناٹے میں وہ آواز اس کے جسم میں جھرجھری پیدا کرتی گزر گئی۔ پھر لے بڑھی، سوز بڑھا، درد جاگا اور ماحول آواز میں ملاسنے لگا۔

ڈاکٹر فرانسس نے چپکے سے اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ مطمئن تھے۔ مگر کرنل صاحب یقین و تشکیک کی منزل سے گزر رہے تھے وہ اسے تکمیل سمجھ رہے تھے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولے۔ جہاں ہزاروں علاج کیے وہاں ایک یہ بھی سہی۔

دونوں ایک راہداری میں خاموش کھڑے تھے بعد از سوز کا سحر جاری تھا ؎

مدہوشی میں احساس کے اونچے زینے سے گر جانے دو
اس وقت نہ مجھ کو تھام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

"پھر یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟"

"بند کردو اسے!"

بند کردو یہ گیت۔ جسے میں بھول جانا چاہتا ہوں"

آخری ہلکورا اس کے حواس سے ٹکرایا ؎

اب کوئی نہیں سنتا ہے تاروں کی آنکھ جھپکتی ہے

آ ساتھ مرے دو گام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے (بخاری)

خاموش رہو۔ خدا کے واسطے۔

میں کہتا ہوں بند کردو" وہ چلا اٹھا" ہیڈ ماسٹر"

اللہ اللہ..." اس نے جالی سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ گیت کی

بازگشت ہوتے ہوتے ماحول میں گھل کر بالکل معدوم ہو گئی۔

لیکن ایک ہیجان انگیز اثر اب تک فضا پر طاری تھا۔

"ٹوٹ گیا وہ خواب" وہ بے خبری میں ہنسا۔

رات ابھی باقی ہے۔

"مگر وہ سحر کہاں ہے؟... کہاں ہے؟..." اور دفعتہً مسز فرانسس

نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اپنی بے ضبطی پر پشیمان سا وہ دم بخود انھیں تکتا رہ گیا۔

دیوار کے کلاک نے بلند آواز میں دو بجائے۔ دیر تک آواز کی جھنکار گونجتی

رہی ٹھیرے ہوئے وقت کا دل دھڑک اٹھا۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔

"ابھی آپ نے کہا تھا کہ خواب ٹوٹ گیا" مسز فرانسس نے کہا "کیا خواب

دیکھا تھا آپ نے؟"

کرنل صاحب کے چہرے پر مسرت کی سرخی منجمد تھی۔ امید افزا نظروں سے جبر

کو دیکھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں..." اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور کرنل صاحب پر ایک شرمسار نگاہ ڈال کر سر جھکا لیا۔

"ہر خواب کی تعبیر نہیں ہوتی میرے دوست! بعض خواب پریشاں بھی ہوتے ہیں۔ دیکھا اور بھول گئے" ڈاکٹر نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں سمجھایا...

"خواب پریشاں۔ بے تعبیر" اس نے ایک سسکی لے کر دہرایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ سراب دھوکا ہے۔ اگیا بیتال... اس کے پیچھے دوڑنا بے فائدہ ہے... مگر کوئی تشنہ کام خود کو کیسے بہلائے۔ ڈاکٹر صاحب.....!"

"غلطی آپ کی بھی تھی۔ کیا آپ نے کسی سے کچھ مانگا تھا؟"

"بے طلب چاہا تھا ڈاکٹر!"

"اور یہی تشنگی آخر میں برگشتگی بن گئی" ڈاکٹر فرانسس نے کہا "کیا آپ محترمہ سحابی سے انتقام لینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں" اس نے کانپ کر کہا "میں نہیں چاہتا اپنی تباہی کا سایہ بھی اس پر پڑنے دوں... وہ بے خبر تھی.. مم.. مگر.. آپ کو یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟"

"یہ کوئی راز تو نہیں ہے؟" انھوں نے کہا "مجھے بتائیے۔ کون تھیں محترمہ سحابی اور مسٹر عظمی؟ ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"تھا کبھی کوئی رشتہ۔ اب نہیں ہے... ڈاکٹر! میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہ دلائیے"

"ٹھیک ہے۔ آپ آرام کیجئے" انھوں نے کہا "زیادہ نہ سوچیے گا۔ کیوں کہ یہ بھی ایک قسم کی بیماری ہے... یہ دنیا ہے مسٹر عبیر! دار المحن۔

لوگ پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں، ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں.... کوئی احساس دیرپا نہیں اور آپ کن کن احساس پر بیٹھے سوچا کریں گے؟ مثلاً آپ کی دوست بے بی تو قمر کی والدہ بیگم الطاف اپنے مذہبی سفر پر چلی گئیں۔ مسٹر شباہت نے شادی کر لی — اور —"

"کیا مطلب.... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" عنبر نے تعجب سے کہا "کب گئیں وہ۔ کب شباہت نے مجھے خبر کیے بغیر شادی کر لی۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ شباہت مجھ سے مذاق کرنا چاہتا ہے" وہ ہنسنے لگا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر مسٹر نزار الحسن کرنل صاحب کی طرف مڑے۔ ایک پرجوش مصافحہ کے بعد بولے۔

"مبارک۔ کرنل صاحب...!"

دانش ہنستے ہوئے رخسانہ کی طرف مڑے "تمہاری خفگی نے بڑا کام کر دیا جو کچھ میں اپنی زبان سے نہ کہہ سکتا وہ بھی میں نے کہہ دیا.. اب دیر کس بات کی ہے ایک مرتبہ ادھر چکر لگاؤ اور سب کچھ طے کر کے چلی آؤ۔ بھئی واقعی بڑا تعجب ہوا۔ بیچارے کرنل صاحب... میرے شکر گزار تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جناب والا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ وقت آیا تھا۔ بات بن گئی — میں نے بھلا کیا کیا ہے —"

"پھر میں کب جاؤں...." رخسانہ نے بے چینی سے پوچھا۔ وہ بہت دنوں قبل گھر آگئی تھیں۔ سب جہاں کے تہاں ہو گئے تھے اور شباہت عنبر کو لے کر آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر کچھ مدت کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اب وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل صحت مند تھا۔ اس کی دیوانگی کی کہانی جو پانچ برسوں پر بکھری ہوئی تھی اس سے کسی نے نہیں کہی۔ نہ اسے کچھ یاد تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ سجانی سوئزرلینڈ سے

اپنے دو بچوں کے ساتھ واپس آئی ہے تو اسے بے حد اچنبھا ہوا تھا۔ مگر وہ تب بھی کچھ نہ بولا۔ اب پہلے کی طرح سنجیدہ، خاموش اور اپنے آپ میں گم رہنے والا پچھلا تجیر بن گیا تھا۔ درمیانی وقفہ اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

مسٹر فرانسس جرمنی واپس چلے گئے تھے۔ ثمینہ بیگم ایک بڑے جشن کی تیاری کر رہی تھیں۔ توقیر کی تنہائی کے خیال سے ملاحت اور سریرا اکثر اسی کے گھر میں رہتی تھیں۔ اور دن بہ تجیر کی تندرستی نے جا ہے جو کچھ رد عمل کیا ہو مگر ملاحت کا عالم ہی جدا تھا۔ وہ جیسے خود ایک طویل بیماری کے بعد اٹھی تھی۔ وہ اضمحلال غم اور پریشانی جو اسے زندہ در گور کئے تھی، اب شادمانی تازگی اور مسرتوں سے بدل گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی بھابی کی گفتگو بھی سنی تھی اور خوشی کے آنسو بہائے تھے۔

گرمی کا موسم اپنے شباب پر تھا۔ کرنل صاحب کے ملازم باغ میں مہمانوں کی نشست کا انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔ دھوپ کی تمازت میں ابھی کمی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی طرف کمرے کے دروازے پر خس کی ٹٹی لگی تھی۔ ملازم جس پر پانی چھڑک رہا تھا۔ فرش پر سریرا اوندھی لیٹی کوئی پکٹوریل پیپر پڑھنے کی کوشش میں لگی تھی۔ توقیر اور ملاحت دور بیٹھی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

"چلو ہٹو" توقیر نے ہنستے ہنستے بُرا سا منہ بنا کر کہا "میں ایسے بودے دل کی نہیں۔ ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ "وہ" جائیں! سچ ... ایسی آزادی نصیب ہو جاتی ہے کہ جیسے لبِ مدت کے قفس کا در کھلا۔

"سچ مچ توقیر! بڑی ناشکری ہو معلوم نہیں کون سی نیکی تمہارے آڑے آئی ہے کہ شباہت بھیا جیسا جیون ساتھی تمہیں ملا ہے۔ کتنے مخلص، پُر محبت اور بلند خیال انسان ہیں... ان کی امی بھی ایسی ہی ہیں... کوئی پابندی نہیں تم پر

پھر کبھی ہو کہ مدتوں بعد قفس کا در کھلا —"

"ہائے اللہ سریر دیکھو تو کیسی پرانی کھوسٹ روح اس کے بدن میں گھس گئی ہے" توقیر نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر پناہ مانگی "کبھی یہ میرے میاں کے گن گائے کبھی میری ساس کے۔ یہ کیا ماجرا ہے آخر؟"

"پرانی بات۔ دال میں کالا —" سریر یہ کہہ کر زور سے ہنسی اور ان کے پاس آ بیٹھی "ایک راز کی بات بتاؤں ... مدحت بیگم آپ شرمائیے مجھ سے"

"اوئی اللہ ... آپ دادی اماں ہیں میری" مدحت نے بے حد پیار سے لہجے میں کہا۔

"دادی اماں سے کون شرماتا ہے؟" سریر بولی "یہ تو تم گلے گلے پانی تسلیم کرو گی کہ میں ابّن کی پھوپھی ہوں"

"واہ ری اپنے منہ میاں مٹھو۔ بالشت بھر کی چھوکری" توقیر بولی "سے کہیں۔ یہ رشتہ۔ پہلے یہ بتاؤ" سریر مچلی۔

"ارے بابا ہے۔ اب آگے بھی بکو" توقیر بولی۔

"فرمانا بلکہ ارشاد عالی یہ ہے کہ" سریر نے اکڑ کر کہا "بھتیجے کی پھوپھی جان اس کی دلہن کی خوشدامن صاحبہ ... لہذا مدحت بی بی آپ کو مجھ سے شرمانا چاہیے کہ نہیں"

"بڑی آئیں" مدحت نے کہا مگر وہ یکبارگی گلابی ہو کر رہ گئی۔ اس کی چوری یوں پکڑی گئی کہ اس نے جو بے ساختہ جھینپ کر سر جھکایا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ توقیر نے سریر کی ہنسی پر بریک لگاتے ہوئے پوچھا:

"سن تو سریر کی بچی! بڑی خوشدامن بن بیٹھی ہے۔ مجھے یہ تو بتا کہ کیا سب کچھ طے ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں چلا"

"ملے تو بہت پہلے سے ہے" سمیرہ نے بے حد خوش ہو کر بتایا "اب مزا لطیفہ ہوگا گارا جونا لگا کر۔ تم دیکھ لینا منو۔ گن گن کے بدلے اگر میں نے نہ چکائے تو میرا بھی نام نہیں۔ ہاں۔"

"کیا بگاڑا ہے بھئی اس نے تیرا سمیرہ۔ کیوں بدلے لے گی تو یہ۔ اے اللہ۔ مجھے یوں نہ ڈراؤ۔" مدحت نے سچ مچ سہم کر کہا۔ سمیرہ یکبارگی ہنس ہنس کر لپٹ گئی اور اس کے گال پر لب رکھ کر بولی:

"تو قیامت ہے۔ اس کی باتوں پر مجھے بے حد پیار آتا ہے۔ یہ کیا پرانی چھوٹی موٹی چھوکری کی طرح ہائے اللہ اوئی اللہ کہا کرتی ہے۔ تو دل چاہتا ہے کہ کاش میں ہوتی شبیر کی جگہ۔"

"چل ہٹ بے شرم۔ یہ کیا بک رہی ہے" مدحت نے شرما کر سمیرہ کو پرے دھکیلا "سچ کہتی ہوں۔ اتنی بے لگام ہے کہ شریف بچیوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔ توبہ توبہ۔"

"شریف بچیاں" سمیرہ نے بے تحاشہ ہنس کر کہا "پھر وہی نانی اماں کی سی بات۔ ارے بیوقوف ایک محترمہ معرفت آشنا بھی ہیں۔ دوسری کو دولت کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ شریف تو دونوں بھی نہیں رہ گئیں۔ ہاں۔ میں بیچاری ضرور شریف ہوں۔ چھی تو یہ کیسی گندی بات۔ ناحق میں اپنی مٹی پلید کرنے کو شادی شدہ عورتوں میں آ گھسی بیٹھی ہوں۔"

"دیکھتی ہو تم اس کی زبان" مدحت بولی "اچھی بات ہے میں کہوں گی چچا جان سے کہ یہ سرکشی گائے اب قابو سے باہر ہوئی جاتی ہے۔ کہیں باندھیے اسے مضبوط۔"

"توبہ خدا بچائے۔ سچ مچ میں اب ایسی خراب باتیں نہیں کروں گی

"اللہ اگر سن لیں گے تو مار ہی ڈالیں گے" سمیرہ نے سنجیدگی سے کہا پھر بولی "مگر میری یہ ذرا سی آرزو پوری کردو۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ضرور شرماؤ۔"

"میں کہتی ہوں توقیر! یہ اسے کیا سودا سوار ہوا ہے" راحت پریشان ہوکر بولی "خدا کے لیے اسے کمرے سے نکال کر دروازہ بند کردو۔"

"بھئی منو اللہ رکھے تو آئے گی نا میرے گھر لہٰذا ابھی سے مجھ سے سمجھوتہ کرلے۔ ورنہ یہاں اور کون ہوگا تیرا۔" سمیرہ نے کہا۔

"چل نگوڑی بد ذوق بلی۔ تو تو خود ہنکائی جائے گی اس گھر سے" توقیر راحت کی کمک پہ آتی ہوئی بولی "اللہ رکھے یہاں عمیر بھیا ہوں گے اس کے راز دار ـــ"

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ان کی باتیں بند ہوگئیں۔

ملازم نے تہمینہ بیگم کی طلبی کا حکم پہنچایا۔ سمیرہ اٹھ کر چلی گئی۔

"بیٹی! دیکھو" انھوں نے دور ہی سے کہا اور اس کی طرف گلابی رنگ کا کاغذ بڑھا دیا "شبو میاں کا تار ہے۔ وہ آج شام کو معہ عمیر کے یہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"اچھا" سمیرہ خوش ہوکر ان کے قریب دوڑی "مگر بھابی امی! اتنی گرمی میں؟"

"مجبوری ہے بیٹے۔ زیادہ دن اکیلے نہیں رہ سکتے۔ شباہت کی چھٹیاں ختم ہوگئیں" وہ ایلیں پھر مسکرائیں "اب ہم نے کچھ اور سوچا ہے۔ عمیر یہاں آجائیں۔ ان کی شادی کردی جائے اور پھر وہ خدا رکھے اپنی دلھن کے ساتھ جہاں چاہیں جائیں۔"

"منو کے ساتھ نا بھابھی امی!" سمیرہ بے حال ہوگئی۔

"ہاں بجی ..... اور کیا۔ تمھیں اس لیے بلایا تھا کہ جو کچھ کرنا چاہتی ہو جلدی کرو" انھوں نے کہا "شباہت یہاں ہوتے تو سارا انتظام وہی کر لیتے سب کچھ تم کو کرنا ہے۔"

"بہت اچھا! بہت اچھا!" وہ پوری بات سُنے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی اور واپس جا کر مدحت سے لپٹ گئی۔

"مبارک ہو۔ وہ شام کو آرہے ہیں" وہ ناچنے لگی۔

انتظام تو سریر کیا خاک کرتی۔ اسے اپنے کھلنڈرے پن سے فرصت کہاں تھی تو قیر البتہ کچن کی خبر لینے چلی گئی۔

"مجھے گھر جانے دو۔ سریر ..... اللہ قسم۔ بہت شرم آئے گی" مدحت نے آنچل دانتوں میں دبالیا۔

"کیا؟" سریر نے آنکھیں نکالیں "وہ تو مذاق تھا۔ مجھ سے کاہے کی شرم؟"

"اری پگلی تجھ سے نہیں" مدحت نے جھینپ کر کہا "وہ ..... وہ ..... ایک گھر میں رہتے ہوئے۔ تم سمجھتی نہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔"

"تم بھر بات نہیں کرو گی اگر تم چلی گئیں۔ بس میرے کمرے میں بیٹھی رہنا۔ میں کہتی ہوں یہ کیا خبط ہے۔ ملتی تو تھیں پہلے بھی" سریر نے کہا "میر خوشامد کی وہیں پھول بار کا بندوبست کر دو تم اُن کا کمرہ درست کر دو" وہ اسے عبیر کے کمرے میں ڈھکیل کر خود باہر بھاگ گئی۔ مدحت کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے عبیر کی آنکھیں ہر گوشے سے اسے دیکھ رہی تھیں ..... اس کے سارے جسم کا خون اس کے رخساروں پر اکٹھا ہو گیا۔ اور دل پسلیوں میں ٹھوکریں کھانے لگا۔ کارنس پر آویزاں عبیر کی تصویر اسے اس طرح دیکھ رہی تھی کہ مدحت کے

لیے کمرے میں ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔

"نہیں" اس نے دل تھام لیا "مجھ سے نہیں صاف ہوتا کمرہ۔"

"بی بی جی یہ پھول ۔" مالی دروازے سے جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رنگ برنگی پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔ جسے لیتے ہوئے مدحت کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس نے دان میں گلدستہ اٹکایا اور پھر سرد و مرتعش ہاتھوں سے جلدی جلدی کشن بدلے، میز صاف کی، ریک درست کیا۔ سرہانے تپائی پر نہ جانے کب سے کپڑا پاس رکھا تھا اسے اٹھا کر دھویا، ملازم سے قالین پر برش کر دیا اور جب سارا کمرہ ڈیکیوم کر دیا تو کمرہ آئینہ کی طرح شفاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک گھڑی نے چھ بجنے کا اعلان کیا اور وہ پردہ برابر کر کے نکل بھاگی۔

مہرینہ نے زبردستی اسے نہلا دھلا کر بڑا خوبصورت لباس پہنا دیا تھا۔ نارنجی رنگ کی جھلمل کرتی ساڑھی اور ہم رنگ بلاؤز میں جب وہ برآمدے میں آئی تو ایسا لگتا تھا جیسے آسمان کے کنارے پر پھیلی ہوئی شفق کا ایک حصہ ٹوٹ کر برآمدے میں آ گرا ہو۔

"منیر بھیا تمہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ جائیں گے" توقیر نے کہا۔

"جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ میں ان کے سامنے نہیں نکلوں گی۔۔۔" مدحت نے کہا۔ مہرینہ نے منہ لٹکا کر بڑی بے کسی سے کہا "اتنی بے رحم ہو جاؤ گی۔ سوچو نا وہ کیسے بڑے مرض سے اچھے ہوئے ہیں۔ پانچ سال تک مسلسل کرب و عذاب کی سختی جھیلی ہے۔۔۔ مدحت۔۔۔ کیا کیا تمنائیں اپنے سینے میں چھپائے آتے ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے کہ مدحت سے ملوں گا تو یہ کہوں گا وہ [illegible] سناؤں گا۔۔۔ تم سامنے ہی نہیں نکلو گی تو بیچارے میرے ابن کا دل

ٹوٹ جائے گا۔ مجھے یہ بالکل گوارا نہیں منو کہ میرے عبیر کے پیارے چہرے
پر فکر کے بادل منڈلائیں۔ تم بھی نہ چاہو گی"

سریہ تو چل دی۔ مگر مدحت کو اور ہی خیالوں میں غلطاں پیچاں چھوڑ گئی
"تمنائیں سچائی ہوں گی۔ میرے لیے یہ سچ ... وہ شرما گئی۔ سریہ اکیلا
اپنے آرزوؤں کے کیسے کیسے حسین صنم میرے معبد دل میں بکھرے پڑے ہیں۔
نہیں نہیں۔ میں ان سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں بھی گوارا نہیں کر سکتی ان
دل ٹوٹ جائے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ مدحت نے انہیں پسند
نہیں کیا —"

سات بجے شام کو شباہت کے پُرمسرت قہقہے نے دونوں کی آمد کی اطلاع دی
سریہ زینوں پر دوڑ گئی اور ابھی عبیر زینے ہی پر تھا کہ وہ اس سے لپٹ گئی۔
نے ہنستے ہوئے اسے باہوں پر سنبھال لیا۔

"ہائیں۔ پھوپی اماں آپ اکیلی کیسی؟" شباہت نے تعجب سے پوچھا۔
"ہائے اللہ شبو بھیا آپ چاہتے تھے کہ توقیر بھی میرے ساتھ آتی" سریہ
نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں پھوپھی اماں پھر مجھے اندازہ کیسے ہو گا کہ وہ میری یاد میں بے چین ہیں"
"چلیے ہٹیے۔ فضول باتیں نہ کیجیے" سریہ بولی۔ اور عبیر کا ہاتھ تھام کر
کہا "آؤ اندر چلو"

"چلو" عبیر نے کہا۔

"پھوپھی اماں آپ کا سہارا تو مجھ غریب بھتیجے کو بھی چاہیے" شباہت
نے ہانک لگائی۔

"بھتیجے اب پاؤں پاؤں چلنا سیکھو" اس نے کہا اور دونوں کو چھوڑ کر

"بیٹے! میرے گھر کی بہو ہے" ثمینہ بیگم نے کہا "چشم بد دور۔ دیکھو تو کیسا سلیقہ اس کے ہاتھوں پر نچھاور ہو رہا ہے... پروردگار گھر بار سے لبنا نصیب کرے۔ چاند سا بیٹا دے"

شباہت نے کان کھڑے کیے اور زیر لب مسکرا کر چہرہ پھیر لیا۔ البتہ توقیر شرما گئی۔ ٹرے سریر کے سامنے کھسکا دی اور خود دور گوشے میں جا بیٹھی۔

"امی... کچھ یاد نہیں آتا۔ یہ شادی کب ہوئی۔ اور کیا دیا میں نے توقیر کو؟..." ضمیر نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا "اپنا فرض میں اب پورا کروں گا..." یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے ہاتھ سے بہت قیمتی انگشتری اتار کر توقیر کو پہنا دی۔

"واہ بھئی! اور میری منہ دکھائی؟" شباہت نے اس لہجے میں کہا کہ وہ سب ہنس پڑے۔

"ضمیر بھائی! مجھے تو ایک بہت قیمتی اور خوبصورت گاڑی دی تھی آپ نے" توقیر بولی۔

"دی ہوگی" وہ بے اختیاری سے ہنسنے لگا "اگر یہ بھی رکھ لو تو کیا حرج ہے"

کرنل صاحب نے انھیں اٹھا دیا تاکہ نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ سریر بہت متعجب تھی کہ اب تک ضمیر نے اپنے کسی ہلکے سے ہلکے اشارے سے یا گفتگو سے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ وہ صاحب کو یاد کرتا رہا ہے۔ پوچھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ وہ گول ہو گئی۔ مگر امی نے ثمینہ بیگم سے کہا۔

"بھابی امی... اللہ۔ اب ہم بھی ضمیر کی شادی کر دیں نا۔ ایک دلہن آئے ہمارے گھر میں"

غیران کے پاس کھڑا تولی سے سر خشک کر رہا تھا۔ شباہت سیلنگ فین کے نیچے کھڑا خنک ہوا سے لطف لے رہا تھا جھٹ سے بولا "ہاں ہاں ضرور اس میں دیر کیا ہے۔ ادھر دانش بھائی نے منظوری دی نہیں کہ ادھر سے غیر صاحب دولھا بن کر پہنچے۔ مگر خالہ امّی ... بھئی ہمارے لیے ایک خوبصورت اور تحفے سے پھوپھا ابا حضور کا بھی کہیں جلدی سے انتظام کیجئے۔ اب تو جی گھبرا گیا ہے۔"

دانش بھائی کی منظوری ... غیر نے سوچا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ویسے وہ شباہت کی بات سن کر اور سریر کا جھلّایا ہوا چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔

" میاں! بہت فکر ہے اس کی" ثمینہ بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا "اللہ اصل خیر سے یہ فرض بھی پورا کرا دے۔ دانش میاں سے تذکرہ آیا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ خیال رکھیں گے۔ اللہ انھیں اچھا رکھے۔ اتنا کام کیا ہے کہ ان کے احسانوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔"

"غیر بھائی! کھانا تیار ہے" توقیر نے کہا۔

"گھر جانے کی بڑی جلدی ہے ... کیوں" سریر نے چٹکی لی۔

"ہش۔ پگلی" توقیر شرما گئی۔

کھانے کی میز پر مدحت کا ساتھ ناگزیر تھا۔ اس نے زیدہ نظروں سے غیر کو دیکھا اور سوچنے لگی وہ سنجیدگی سے مسکراتا ہوا کتنا اچھا لگتا ہے اس کی نشست کرنل صاحب کے پہلو میں تھی اور ان کی موجودگی میں وہ بڑا خاموش ہو رہا تھا۔ پاس ادب نے شباہت کو بھی چہکنے سے باز رکھا تھا۔ کھانے کے بعد شباہت نے پھر اجازت چاہی۔

"اچھی بات ہے۔ بیٹے جاؤ۔ اگر تمھاری مجبوری نہ ہوتی تو میں اب بھی تمھیں جانے نہ دیتا۔ اپنی والدہ محترمہ سے میرا سلام کہہ دینا۔ اور ہاں ... یہ تو تمھاری شرط تھی کہ تم اور توقیر بی روز شام کو یہاں آجاؤ گے" کرنل صاحب نے کہا۔

"جی ہاں" وہ ہنسنے لگا "مجھے اپنی شرط یاد ہے چچا جان! عنبر کے بغیر میرا خود بھی دل نہیں لگے گا۔"

"کچھ تو ٹھہر بیٹے!" سریر نے لقمہ دیا "چائے تیار ہے۔"

"اچھا تم لے آؤ۔ ہم باغ کے راستے جاتے ہیں" شباہت نے کہا اور سب سے مل کر رخصت ہوا۔ مدحت و توقیر بھی ساتھ تھیں۔ سریر کشتی میں چائے لے کے پیچھے پیچھے بھاگی۔"

باغ کے گیٹ پر شباہت کی گاڑی کھڑی تھی۔

چاروں طرف تیز چمکیلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ اکا دکا ستارے چمکے ہوئے تھے۔ بارھویں شب کا چاند بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ ہواؤں کے نرم اور معطر جھونکے روح میں ایک تازگی پیدا کر رہے تھے۔ موسم اتنا سحر انگیز تھا کہ وہ چاروں حوض کے کنارے ٹک گئے۔ اور خاموشی سے موسم کی دلکشی کا لطف اٹھانے لگے۔ سریر نے چائے پیش کی ... پندرہ منٹ کے بعد شباہت نے بوکھلا کر عنبر کی طرف رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا

"اچھا بھائی ... اب اجازت دو۔ کل انشاءاللہ پھر ملوں گا ...
خدا حافظ ....."

"مجھے اپنا منتظر نہ رکھنا شباہت! ... ضرور چلے آنا" عنبر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں دوست باتیں کرتے ہوئے گیٹ تک چلے گئے۔

پھر تو نیر بھی اپنی سہیلیوں سے مل کر رخصت ہوئی۔ اس نے بہت شرما کر عبیر کو سلام کیا۔

اس نے اسے شرمندہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ نہایت سنجیدگی سے جواب دیا" اچھا بھئی خدا حافظ و ناصر۔ کل میں تمھارا منتظر رہوں گا۔"

ان کی گاڑی جب آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تب وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا واپس پلٹا۔ سریر واقعی شربت چکی تھی۔ مدحت کو باغ میں اپنا منتظر چھوڑ کر وہ ٹرے لیے ہوئے اندر چلی گئی اور کہتی گئی:

"میں ابھی آئی۔ اتنی پیاری چاندنی چھٹکی ہے۔ کچھ دیر یہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے"

"مجھے بھی جانے دو سریر!... دیر نہ ہو جائے" مدحت بولی۔

"ابھی تمھاری کار کہاں آئی ہے" سریر نے کہا "اور ایسی دیر بھی نہیں ہوئی۔"

مدحت حوض کی منڈیر پر ٹک گئی اور چاند پر نظریں جما دیں۔ موسم کی دلفریبی نے اسے ماحول سے بے خبر کر دیا۔ ایک سکوت افزا سحور کن تیز چاندنی روپہلی چادر کی طرح ساری کائنات پر پھیلی ہوئی تھی۔

دفعتہً وہ چونک پڑی۔ عبیر کی موجودگی کو وہ فراموش کر چکی تھی۔ مگر اب وہ اس سے بہت کم فاصلے پر کھڑا تھا۔ مدحت کو احساس نہ تھا کہ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مدحت کو اب سریر کی غیر موجودگی پر اسرار لگی۔ شاید وہ بہانہ ساز موقع دے کر بھاگ نکلی تھی۔ اسے سریر پر غصہ آنے لگا

عبیر نے کھانے کی میز پر اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اور پھر یہاں دیکھ کر یہ خیال کیا کہ وہ سریر کی کوئی سہیلی ہو گی۔ وہ اسے بالکل نہ پہچان سکا۔

کیونکہ وہ اس کے دورِ خود فراموشی کی شناسا تھی۔

اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ عبیر نے سوچا۔ مگر یہ لڑکی اس بے وفا سے اچھی لگتی ہے جو مجھے دیکھ کر خواہ مخواہ مسکراتی نہیں۔۔۔ عبیر کو بھی سریہ ہی کا انتظار تھا۔ باغ کی تنہائی میں ایک لڑکی کو اکیلے چھوڑ کر اندر چلے جانا اس کے اخلاق سے بعید تھا۔

مدحت دل ہی دل میں جھنجلا گئی۔ یہ کیا کہ جب شاہ کا روزہ رکھ کر کھڑے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ خفا ہو گئے ہوں۔ بیماری کے زمانے میں کسی نے ملنے نہیں دیا۔ شاید ناراض ہوں کہ اس نے تیمارداری کا حق ادا نہیں کیا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھائیں اور عبیر کو چاند سے نظر بازی کرتے دیکھ کر بہت مدھم لہجے میں بولی :

"بڑی دیر سے آپ کھڑے ہیں۔۔۔ بیٹھ جائیے۔۔۔ سریہ ابھی تک نہیں آئی۔

اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر عبیر نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے بہار کی نودیدہ کلی کو دیکھ کر اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔

"آپ اس سے ملنا چاہتی ہیں تو آئیے میں آپ کو پہنچائے دیتا ہوں۔"

"جی؛۔۔۔ مدحت نے بے حد تعجب سے کہا" یہ انداز تخاطب۔۔۔ اجنبی لہجہ۔۔۔ شناسائی کی جھلک تک سے یکسر مبرا۔۔۔ رسمی اور پر تکلف۔۔۔ اس نے تو کبھی آپ جناب سے مخاطب نہیں کیا تھا۔۔۔ سچ مچ خفا ہیں۔

وہ مسکرائی۔ بھی تو بالکل بدھو سی۔ سوچے سمجھے بغیر بولی :

"آپ کی خفگی بے جا ہے۔ جب کسی نے مجھے آپ کے پاس آنے ہی نہیں دیا تو

میں کیا کرتی ۔ سچ سچ ۔ میرا اتنا جی چاہتا تھا کہ آپ کی میں خوب خدمت کروں،
آپ کے سارے غم لے لوں ۔ مگر میں مجبور کر دی گئی ۔۔۔ کیا کرتی ؟ آپ تو سمجھتے
نہیں ۔ خفا ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔"

بشیر کا دل دھڑکنے لگا ۔ معلوم نہیں اس کو کیا دھوکا ہوا ہے ۔ خدمت
۔۔۔ غم ۔۔۔ اور مجبوری کا تذکرہ ۔۔۔۔۔ وہ تو کبھی بیمار نہیں پڑا ۔ یہ کیا
قصہ ہے ؟ وہ چپ چاپ کھڑا رہا ۔

"اب تو آپ کی طبیعت بالکل اچھی ہے نا ؟ ۔۔۔ یا اللہ آخر کب
تک کھڑے رہیئے گا ۔ بیٹھ جایئے ۔ دیکھئے ! میں نے اپنی مجبوری آپ سے
بیان کر دی ۔ مجھے معاف کر دیجئے ۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے بڑی بے چینی رہے گی"

بشیر اس کے اصرار پر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا ! اور بشیر سوچنے لگا کہ کیا
جواب دے ۔ اس لڑکی کا دل نہ ٹوٹے ۔ اور جواب شرافت سے بعید بھی نہ ہو

"آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ ۔۔۔" اس نے سر جھکا کر اپنی
دل نشیں آواز میں کہا " یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ میں آپ سے خفا بھی
ہو سکتا ہوں ۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ ـــــ

وہ بے حد شرمسار سی ہنسی ہنسا اور کچھ اور سر جھکا کر نہایت ندامت سے
کہا " دراصل بات یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے ۔ کہ میں
آپ ۔۔۔۔"

مرحت کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ۔" آپ ۔ آپ ۔۔۔
نے کیا رٹ لگائی ہے ۔ اتنی بھی غیریت کیا ۔ یا تو آپ مجھے
ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے ملا کرتے تھے ۔ مرحت ۔ مرحت
خشک ہوتے تھے ۔ یا اب یہ ناراضی ہے کہ سوائے

کچھ بولنے ہی نہیں —" وہ خشمگیں تیوروں سے اسے دیکھنے لگی اور بے حد حیرت
سے غیر اسے تکنے لگا۔ مبہوت اور ششدر دونوں تھے۔ عجیب انداز کا تحیر
تھا کہ کوئی انھیں دیکھ لیتا تو بے ساختہ ہنس پڑتا۔

"آپ نے یہ بھی نہیں سوچا عزیز آپ کی وجہ سے کتنی پریشان رہی ہوں
ایک وحشت سی میرے دل میں سمائی تھی کہ معلوم نہیں آپ کی بیماری کیا رنگ
دکھاتی ہے۔ بہتیری راتیں تو یوں بھی گزریں کہ پلک سے پلک نہ لگی۔ خدا بہتر
جاننے والا ہے۔ جب میں نے سنا کہ مسلسل ہفتہ بھر کی بے ہوشی کے بعد آپ
نے آنکھیں کھولی ہیں، تو ایسا معلوم ہوا جیسے خود میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔
میں نے سجدے میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ پروردگار آپ کے سارے غم مجھے
دے دے... آپ سدا خوش رہیں..."

"وحشت وحشت کہتے میرے لب خشک ہوتے تھے..." غیر نے زیر لب کہا
اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا... کب کی بات ہے؟ کیا یہ واقعہ خواب
کا ہے؟ کیا میں ابھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں... یہ نا ممکن ہے کہ اتنی
پیاری معصوم سی لڑکی بغیر کسی شناسائی کے مجھے یوں دعوت دینا ہے۔ یہ اتنی
تیز طرار اور شریر تو بالکل نہیں معلوم ہوتی۔ چہرے پر تقدس اور پاکیزگی ہے
آنکھوں سے حیا جھلکی پڑتی ہے۔ سر پر آنچل اوڑھے نسائیت کے نور میں
ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کیا تماشہ ہے؟" وہ حیرت اور تعجب
سے دم بخود سا رہ گیا۔ "یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے؟؟"

"مگر میں سب کے ساتھ ساتھ تمھیں بھی بھول کے بیٹھ گیا۔"

آپ کو بھول نہیں سکتا" بے ساختہ اس کی زبان

سے نکلا۔

"پھر وہی آپ جناب ..." مدحت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "سچ بتائیے! اگر آپ مذاق نہیں کر رہے ہیں تو پھر اتنے غیر کیوں بن گئے ہیں"

"غیر.... ؟" شبیر عجیب و غریب احساسات سے دوچار تھا۔ ایک مرتبہ پھر نہایت ندامت انگیز لہجے میں کہا "معاف کیجیے... میں آپ کا نام بھول گیا"

"نام بھول گئے؟" مدحت کی آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی۔ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ وہ پیار، وہ خلوص، وہ محبت جو اس کا خاصہ تھا۔ اور وہ برگشتگی وہ خود فراموشی، وہ بیگانگی جو اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی آخر رنگ لائی۔ وہ اسے بھی بھول گیا۔

"جی ہاں! مجھے شرمندگی ہے" شبیر کے اس طرح کہنے پر اسے یقین ہوا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ وہ بے حد سنجیدہ ہے۔ گہرے تفکر اور خلش کی پرچھائیں اس کے دلکش و دلفریب چہرے پر منجمد تھی.... خالی خالی نظریں، جن میں واقفیت کا شائبہ بھی نہیں تھا... مدحت کا دل بیٹھنے لگا۔ چاندنی اندھیرے میں بدلنے لگی۔ ہواؤں کا ترنم کراہنے لگا۔ اس کے لب کانپے اور یکبارگی آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔

"آپ کی پچھلی باتیں... آپ کی وہ محبت ... آپ کی تسلی دلاسے وہ سب دھوکا تھا، بہلاوے تھے۔ یہ آپ نے کیا کیا... کیا کیا؟" شبیر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ مدحت پھر وہاں نہیں ٹھہری۔ اس سے کچھ کہا بھی نہیں۔ اٹھی اور مڑ کر بھاگ گئی۔

جشن میں بہت کم دن باقی رہ گئے تھے۔ ثمینہ بیگم کا خیال تھا کہ اسی روز ظہیر و طلعت کی منگنی کا اعلان کردیا جائے۔ مگر وہ کرنل صاحب کو فکرمند اور ظہیر کو بہت پریشان دیکھ رہی تھیں۔ ان کے لاکھ کچھ پوچھنے پر بھی دونوں نے کچھ نہ بتایا۔

اس صبح ناشتے کی میز پر تقریباً سب اکٹھا تھے۔ ثمینہ بیگم کی کسی معمولی سی بات پر کرنل صاحب برہم ہوگئے۔ خفگی اور غصہ ان سے بعید تھا۔ حیرت سے سب انھیں دیکھنے لگے۔

"تمھارا، شاہت کا اور غالباً ان لوگوں کا مطلب بھی یہی ہے کہ میں ایک مرتبہ پھر ان کے قدموں پہ سر جھکاؤں۔۔۔ وہ گرج کر بولے "میں پوچھتا ہوں انھیں انتظار کس بات کا ہے؟"

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتے بھائی جان کہ وہ اس قسم کی پہل نہیں کرسکتے" سطوت نے کہا "اگر ایک مرتبہ ہم ہی تجدید کردیں تو کیا برا ہے"

"پھر ایسی اچھی لڑکی نہیں ملے گی" ثمینہ بیگم نے کہا "میں تو آج ہی جاؤں گی"

ظہیر جلدی سے چائے حلق میں انڈیل کر اٹھ گیا۔۔۔ ظہیر کا دل صاف تھا۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا:

"مگر انھوں نے معافی مانگ لی تھی اور آپ نے انھیں معاف بھی کردیا تھا"

"کیا کرتا؟۔۔۔" کرنل صاحب کو پچھلا غصہ اب یاد آیا "کوئی سی سزا دیتا۔ کیا کہتا۔۔۔ کیا تم نہیں جانتے اس وقت حالات کیا تھے؟"

"زبان سے معاف کر دینا اور دل میں بات رکھ کر دشمنی باندھ لینا تو
کوئی اچھی بات نہیں ہے" ثمینہ بیگم جان پر کھیل کر بول ہی دیا۔

"کیا؟؟" خونخوار آنکھوں سے انھوں نے بیوی کو گھورا۔

"بھائی جان! آپ سمجھے نہیں...." ظہیر نے جلدی سے کہا۔
"بھابی کا مطلب یہ ہے کہ آپ زبان کا پاس کیجئے!"

"ہاں ہاں، میں سب سمجھتا ہوں۔ گھاس نہیں کھا گیا ہوں" وہ
برافروختہ ہو کر بولے "پہلے وہ بدبخت پاگل تھا، کسی لڑکی کے قابل نہیں
تھا۔ اور اب — میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بدبخت میرے بچے کے
قابل نہیں...."

ظہیر صاحب نے بدقت اپنی ہنسی ضبط کی اور یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے
"غصے کی بات تو واقعی ہے۔ مگر اب جانے دیجئے۔ آپ سب کے بزرگ
ہیں اور مدحت کو آپ بھی بہت پسند کرتے ہیں...."

ثمینہ بیگم نے سوچا نہ جانے کس بات پر لال پیلے ہوئے جا رہے ہیں
وہ بھی خاموش ہو رہیں۔

"تم جاؤ گی دوبارہ بھیک مانگنے؟" ..... وہ پھر ابل پڑے۔

"جیسا آپ کہئے" ثمینہ بیگم نے نہایت ہوشیاری سے کہا "آپ کی
مرضی ہو تو جاؤں، آپ کی مرضی نہ ہو نہ جاؤں۔ مگر ماشاء اللہ اب ان کی
عمر شادی کے قابل ہے۔ اس کے لیے دوسری لڑکی تلاش کرتے کرتے
مہینوں لگ جائیں گے۔ میرا تو یہ مطلب تھا کہ مدحت دیکھی بھالی ہے"

"واللہ! کمال ہے...." وہ غصے سے ہنسی ہنسے "یعنی بھول جاؤں
اپنی توہین... اہانت... اور ذلت؟"

چکے ہو، جنھیں خدا نے سکھ سے بدل دیا ہے۔ عبیر!... یہ میری التجا ہے کہ تم سب کچھ بھول جاؤ! اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو!"

"کیا تمھیں معلوم ہے، مدحت بہت چاہتی تھی مجھے؟" عبیر نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"چاہنا؟" سریہ نے آنکھیں نکالیں "نہیں عبیر!... چاہنا بالکل معمولی چیز ہے۔ وہ تو مر سکتی ہے تمھارے لیے۔"

اچھا تو چلیں مدحت کے گھر... میں اُن سے معافی مانگوں گا۔ بڑا بے مروّتی کا سلوک کیا۔ مجھے وہ سنگدل سمجھے گی، بے وفا کہے گی... تمھیں اگر کچھ کام نہ ہو تو چلو میرے ساتھ۔ مجھے بیرسٹر صاحب کا گھر معلوم نہیں ہے" عبیر نے کہا اور وارڈروب سے لباس نکال کر غسل خانے میں چلا گیا۔ پھر دونوں کمرہ بند کر کے آئے تو کرنل صاحب نے پوچھا "اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ مجھے بھی تم سے کچھ کام تھا" عبیر کچھ کہہ نہ سکا۔ مگر سریہ شوخی سے بولی:

"کہہ دو نا بھئیے۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ دلھن کی منہ دکھائی کے لیے گہنے خریدنے جا رہا ہوں۔ بولو نا عبیر!... تم تو چھوئی موئی بنے جا رہے ہو۔"

"بس اسی طرح میرا دماغ کھایا کرتی ہے۔" عبیر نے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ ہنس پڑیں گے۔ مگر ان کا موڈ صبح سے چوپٹ تھا۔ یکبارگی بگڑ گئے اور سریہ کو بری طرح ڈانٹ دیا۔

"تم نے تمیز نہیں سیکھی۔ کیا عبیر کو تم اپنے برابر سمجھتی ہو؟ مجھے یہ حرکتیں قطعی نہیں پسند کہ فضول مذاق میں بڑوں کا ادب و احترام نہ

کیا جائے؟ کیا تمھیں یہ بھی کسی نے نہیں سکھایا بڑوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرنا چاہئے؟"

وہ جب پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے تو نبیر اُس کی طرف مڑا۔ پہلے تو چپ چاپ مریم سر جھکائے کھڑی رہی پھر یک بیک شرمندگی کے مارے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

نبیر نے اُسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"نہ رو مریم!... آج ڈیڈی کو نہ جانے کس پر غصہ ہے۔ وہ انھوں نے تم پر اُتار دیا۔"

مریم کی پلکیاں بندھ گئیں۔ "میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ تمھاری کتابیں، پیسے اور اتنی ساری چیزیں رکھی ہیں وہ میں سب دے دوں گی۔ میں تمھاری کون ہوتی ہوں؟"

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے تم پاگل بناؤ گی... آؤ چلیں... میری اچھی بیٹی۔"

اُس نے اسے منایا سمجھایا... بڑی دیر بعد وہ سنبھلی۔ مگر دل گرفتہ تھی۔

پھر [illegible] صاحب کی [illegible] سناٹا تھا۔ ملازم نے بتایا "صاحب کچہری گئے ہیں، بیگم صاحب باہر گئی ہیں..."

مریم نے تائی سے پوچھا "اور منجھلی کہاں ہیں؟"

"اُن کی طبیعت دو تین روز سے خراب ہے۔ اپنے کمرے میں ہوں گی"

"نبیر!" اُس نے اُس کے پاس سرک کے سرگوشی کی۔

"کیا؟" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ایسا لگتا ہے اس پر تمھاری بے رخی کا بہت اثر ہوا ہے" مریم نے کہا "تم اب سے ملنا تو کہہ دینا کہ وہ سب تم نے اُس سے مذاق کیا تھا۔"

"زندگی کا اتنا بھاری جھوٹ ہمیشہ میرے سینے پر بوجھ بنا رہے گا
سریہ!... میں اس سے سب کچھ کہہ دوں گا۔ چاہے مانے چاہے نہ مانے
" خیبر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

مدحت کی زندگی سے سب کچھ نکل گیا تھا۔ نہ جانے کیا کچھ اس نے
سوچا تھا۔ کچھ نہ ہوا۔ اصنام خیالی کہیں خیال ہی کی دنیا میں گم ہو گئے
تھے۔ اس کے پاس آرزو، تمنا اور امنگ نام کی کوئی چیز نہیں، جس کے
سہارے زندگی بسر کرتی۔ ویران اور اداس ہو کر رہ گئی تھی اور یہ بھی
نہ دیکھتی کہ بھائی بھابی اس کی شادی کا سامان کر رہے تھے۔ ہوک سی دل سے
اٹھتی... کیا حال ہوگا سب کا۔ اگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ یہ
شادی کرنا نہیں چاہتی اس ظالم اور بے وفا سے، جس نے کل تک اس
کے پیار میں جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور آج اس کا نام تک
بھول گیا تھا ——— ایک آگ سی اس کے سارے جسم میں پھیلنے لگی ——
کیسے وہ اب بھی اس بے درد اور ناآشنا کی محبت میں زندگی بھر
بیاہی کا زہر پیئے، اس کا نام لے کر جیئے، اس کے غم کو حرز جاں بنا
کر اس کے ساتھ ہرگز نہ رہے گی... وہ انکار کر دے گی۔ آج
ابھی کل سویرا!

"مدحت!..." سریہ کی آواز نے اس کا غم جگا دیا۔ جلدی جلدی
آنسو پونچھے، مگر کچھ نہ بولی۔ سریہ اندر آئی اور اس کے پہلو میں چپ چاپ
بیٹھ گئی۔

"میکہ چھوٹنے کا اس قدر افسوس؟" مکاری سے سریہ بولی۔
"خوشی کے آنسو ہیں" مدحت نے رکھائی سے جواب دیا۔ "سسرال

مدحت نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

سریرے دبے پاؤں باہر نکلی اور عبیر سے بولی "جاؤ وہ تمھاری منتظر ہے"

عبیر بھی فکرمند نظر آرہا تھا۔ وہ سریر کے جھوٹ کو سمجھ نہ سکا۔ سگریٹ خاکدان میں پھینکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

"کیا سوچیں گے وہ دل میں ۔ ۔ ۔" مدحت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اُسے کیا کرنا چاہیئے۔

"مدحت ! ۔ ۔ ۔" عبیر کی آواز اس پر بجلی بن کر گری، چہرے سے ہاتھ ہٹ گئے اور وہ حیاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

عبیر نے اپنی مخصوص، مدھم اور دلکش آواز میں کہا:

"محبت کے مستحق پاگل ہی نہیں، ہوش مند بھی ہوتے ہیں ـــ"

وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

وہ چپکے چپکے کانپنے لگی۔ کچھ شرم تھی کچھ ندامت اور گھبراہٹ ـــ

"میرے لیے وہ پاگل پن ہی اچھا تھا مدحت ۔ ۔ ۔ جب تم ۔ ۔ ۔ میری تھیں۔ اب تو میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ جوانی واپس آئی اور زندگی رخصت ہو گئی"

وہ تب بھی چپ رہی تو عبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "مدحت ! میری طرف دیکھو! میری بات سنو!!"

"کہئے نا ۔ ۔ ۔ سُن رہی ہوں"

"دیکھو تو میری طرف !"

"اب آپ کا زخم کیسا ہے" اس نے گھبرا کر بات بدل دی۔

"شاید ہی کبھی مندمل ہو۔"

"یا اللہ... کیوں؟" اچانک اس کی نگاہیں عبہر کی طرف اٹھ گئیں۔

"بہت... گہرا... ہے۔" اس نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے نے مدحت کو شرما دیا۔

اس نے اپنا ہاتھ عبیر کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"اس زخم کے لیے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے مدحت!.... ایک چارہ گر کی ضرورت ہے۔ ورنہ زخموں پر زخم لگیں گے اور میری زندگی ناسور بن کر رہ جائے گی۔"

"خدا نہ کرے۔ یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔"

مدحت محجوب تھی۔ پہلے وہ دیوانہ تھا۔ جو کچھ چاہا کہہ دیا۔ لیکن یہ تو ہوش مند تھا، اس کے قرب نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا رکھی تھی۔

"آج مجھے بہت سکون ہے" عبیر نے کہا "کوئی بھاری بوجھ میرے سینے سے اتر گیا ہے۔ مجھے میری منزل مل گئی ہے۔ مجھے احساس کی زبان کسی نے عطا کر دی ہے... مدحت! تم میری زندگی ہو ساتھی ہو..." اس کا لہجہ اندرونی ہیجان سے کانپ رہا تھا۔ پھر وہ جلدی سے اٹھا، اپنی جیب سے ایک خوشنما انگشتری نکالی اور مدحت کی انگلی میں پہنا دی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مدہوشی میں گر ہی پڑے گا۔

"اچھا... مدحت... پھر ملیں گے... الوداع۔" وہ پردہ ہٹا

کر باہر نکل گیا۔

"کہاں؟ کہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" سریہ احمقوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑی وہ اُسے جواب دیے بغیر زینے اُترتا چلا گیا۔

شام کو کچھ کہے سنے بغیر ثمینہ بیگم اور سطوت جہاں وغیرہ مٹھائی اور انگوٹھی لے کر بیرسٹر صاحب کے گھر جا پہنچیں۔

بیرسٹر صاحب ان سب کے بڑے مدّاح تھے۔ انھوں نے اپنی دانست میں کرنل صاحب کا گھر تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مگر کرنل صاحب سب کچھ میٹھے گھونٹ کی طرح پی گئے۔

ان کی طرف سے انگوٹھی اور طلائی گھڑی خیبر کو بھیجی گئی۔

وہ بڑا شاندار جشن تھا، جو دونوں گھروں کی طرف سے منایا گیا۔

ساز بج اٹھے۔

لان پر قہقہے اُڑ رہے تھے۔

جیسے سارے راگ پنچم سروں میں بجنے لگے تھے۔

جشن و مسرت کا راگ۔

خیبر کو پھولوں سے ڈھک دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ثابت کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ اس نے ایک طلائی مرصع ہار اس کی گردن میں پہنایا اور پھر اس کے لپٹ گیا۔

"تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

"نظر لگ جائے گی۔ بس کرو۔" سریہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش ۔ ۔ ۔ ۔ پھوپھی اماں تم کیا جانو۔"

میدانِ امتحاں میں اے! بے غرض محبت
دل کی زمین میں نے ٹکرادی آسماں سے "

جشن کے اختتام پر کرنل صاحب نے عبیر و شہباز کی منگنی کا اعلان کر دیا اور کمیں سے روشنی اور موسیقی کا سیلاب امنڈ پڑا۔
یہ مستی، سرشاری، سرخوشی اُسے بڑی شدت سے بے چین کر رہی تھی یہ غل شور، ہنگامہ کسی تنہائی اور ویرانی کی تمہید تھا... دل کیا اداس تھا کہ ساری دنیا اداس تھی۔ لب مسکرا رہے تھے، آنکھیں نم تھیں، نہ جانے کون کون سی آرزوئیں کہاں کہاں چھپی رو رہی تھیں۔ کاش! اس نے سوچا بے وفائی کا داغ اتنا کاری اور ایسا گہرا جگر پر نہ لگا ہوتا۔
شباہت اسٹیج پر جا چڑھا تھا۔ موسیقی کا بڑا دلکش پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ اس نے عبیر کو اشارے سے بلایا۔ ایک سسکاری سی ان کے ہونٹوں پر مچلی سی

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

اور اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

ختم شد

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ببول کے گیت	10/-	شبنم کے سہارے	6/50
آخری تحفہ	10/50	شہر آرزو	6/50
بزدل	7/-	صنم	10/-
پندار	زیر طبع	غمگسار	زیر طبع
پیمان	12/-	فاصلے اور منزل	10/-
درد کا رشتہ	12/-	قافلے بہار کے	زیر طبع
داغ دل	9/-	محبت کی راہیں	6/50
درد و درماں	7/-	محبت نام ہے غم کا	7/-
راز	9/-	مداوا	10/-
سزا	8/-	ملے نام بھی آہستہ	8/-
سویرے	9/-	شام تمنا	8/-
سچے بندھن	6/-	ہم سفر	12/-
زرد پتیاں	10/50	صہبا	15/-

ناشر

نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ